www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10 ₹

آدمی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جولائی 2017

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

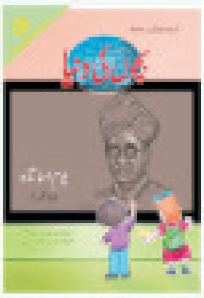
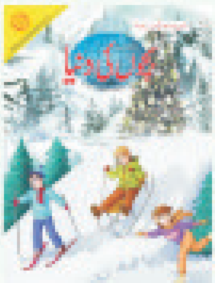

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

اردو آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جلد: 1 شمارہ: 2 جولائی 2017

مدیر: پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

مشیر: شعیب رضا فاطمی

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی- 110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ اینڈ ڈیزائننگ: محمد فہیم

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025 فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7

آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 26109746 فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 22-7-110، قمر انفور، سالار جنگ کمپلیکس

بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار، حیدرآباد- 500002

فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ

مکالمہ — مدیر — 4

شخصیت

بی اماں ایک عظیم مجاہدۂ آزادی — 5
عبدالعزیز عرفان

پرواز کے نئے آسمان

شاباش ام الخیر — ایم ودود ساجد — 9

نکہت سخن

شاعرات کے منتخب اشعار — 11

جہان نسواں

نسائی شاعری اور صنفی مساوات — 12
علیمہ فردوس

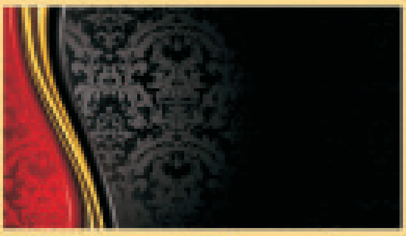

جدوجہد آزادی میں خواتین کا حصہ — 15
سمیرا مومن

اکیسویں صدی کی خواتین کو درپیش مسائل — 19
نصرت جہاں

چراغ بجھتے رہے اور خواب جلاتی رہی — 21
عزہ معین

قانون میں خواتین

تعزیرات ہند اور خواتین جنسی و دیگر جرائم — 24

کہانیاں

دھوپ کا شہر — شاہدہ شاہین — 28

انتظار کے لمحوں کا کرب — تسکین زیدی — 32

پینٹنگ — افشاں ملک — 35

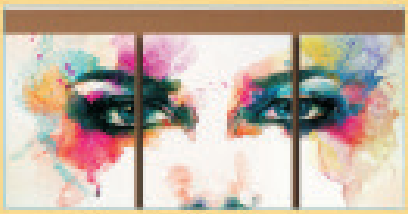

تن ریزہ ریزہ — ناہید اختر — 39

شیشے کا دروازہ — صادقہ نواب سحر — 43

ایک باپ کی بھٹکتی روح — شفیقہ فرحت — 48

حسن سخن

عصمت زیدی 51 ، رضیہ حیدر خان 51

ساجدہ زیدی 52 ، شفیق فاطمہ شعریٰ 53

علینا عترت 54

باورچی خانہ

لذیذ پکوان — 55

آرائش و زیبائش

گرمیوں میں جلد کی حفاظت — 57

تاثرات — 59

خواتین خبرنامہ — 61

مکالمہ

اردو زبان وادب کے فروغ میں خواتین کا کردار ہر دور میں اہم رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس زبان نے ترقی کے مدارج طے کرنے میں بہت کم وقت لیا۔ اس دور میں بھی جب نام تک کا پردہ روا تھا'' بنت فلاں'' ''ہمشیرۂ فلاں اور'' زوجۂ فلاں'' کی آڑ لے کر ہماری ماؤں بہنوں نے اپنے جذبات واحساسات کو اردو زبان کے وسیلے سے مشتہر کیا۔ دور بدلا تو ان خواتین کا رویہ بھی بدلا اور انھوں نے ایک طرف قلمی رشحات کو جنون شوق کی سان پر اس قدر صیقل کیا کہ اسے تخجر بنا دیا تو دوسری طرف اپنے مصفّٰی شیر سے ایک ایسی نسل کی پرورش کی جنھوں نے اردو زبان وادب کو عالمی ادب کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ رضیہ سلطانہ اور بیگم حضرت محل سے بی اماں تک کی حقیقی کہانیاں صرف اولوالعزمی کی داستان نہیں ہیں اس کے جلو میں اس نہایت فعال معاشرے کی بچی تصویریں بھی ہیں جس معاشرے نے ہمیں ہماری مادری زبان میں بے حد اہم شہپارے دیے، دلوں کو گرما اور برما دینے والی شاعری دی اور ایسے ایسے نعرے دیے جو آج بھی ہمارے کام آتے ہیں۔

زبانیں نہ تو ہوا میں پیدا ہوتی ہیں اور نہ ہی فضا میں معلق ہو کر پروان چڑھتی ہیں۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ زبان کو سب سے اہم بنیاد خواتین فراہم کرتی ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم نے اپنے معاشرے میں خواتین کو کس حد تک زبان وادب سے آشنا کیا ہے؟ محض 100 برس کی ادبی تاریخ کا سرسری جائزہ لیتے ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ جب تک ہمارے گھروں میں زبان وادب کا چراغ جلتا رہا اور ہماری ماؤں بہنوں کی دلچسپی زبان وادب سے رہی اردو زبان کے فرزانوں کا قافلہ نکلتا رہا لیکن جیسے ہی خانگی محاذ کمزور ہوا اردو زبان کسمپرسی کا شکار ہوگئی۔ مقاصد بڑے ہوں تو قربانیاں بھی دینی پڑتی ہیں صرف حکومت کی اعانت سے بڑے مشن کو کامیابی سے ہمکنار نہیں کیا جا سکتا، اس کے لیے معاشرے کے ہر شخص کو عملی تعاون دینے کے لیے تیار ہونا ہوگا اور جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے تو اس کی حفاظت اور تشہیر تہذیب ہند کی تشہیر ہے۔ یہ اس روایت کی تشہیر ہے جس رسن روایت سے ایک ساتھ خسرو وکبیر سے لے کر غالب وجائسی تک بندھے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اردو زبان کا بڑا نقصان سیاسی چپقلش کا نتیجہ ہے لیکن اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سنجیدہ ادب تحریر کرنے والوں میں خواتین کی شمولیت آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ تخلیق، مشاہدے کی زمین پر برگ وبار لاتی ہے اور مشاہدے کی صلاحیت صنف نازک سے زیادہ کسی جاندار میں نہیں۔ ہمیں اپنی صفوں میں خواتین کی تعداد بڑھانی ہوگی انھیں ادبی معاشرے میں پھر سے نذر سجاد حیدر، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کی جانشینی کا فرض ادا کرنا ہوگا تب جا کر اردو زبان وادب کا کارواں اپنی مکمل توانائی کے ساتھ عالمی ادب کے شانہ بشانہ چل پائے گا۔

یہی وہ اہم نکتہ ہے جس کے سبب بے حد غور وفکر کے بعد قومی کونسل برائے فروغ زبان کے ارباب حل وعقد نے 'خواتین دنیا' کے اجرا کا فیصلہ کیا۔ ہمیں فخر ہے کہ قومی کونسل کے دیگر رسائل کی جس طرح پذیرائی ہوتی رہی ہے خواتین دنیا کی بھی ہو رہی ہے اور دنیائے اردو ادب میں خواتین دنیا نے بلند آہنگ دستک دے دی ہے۔ خواتین کا ایک بڑا حلقہ اس جانب متوجہ ہو رہا ہے اور یہ حلقہ ارتعاش آب کی طرح پھیلتا جا رہا ہے۔ میری گزارش بطور خاص اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ سمیت ریسرچ اسکالرس سے ہے کہ وہ خواتین دنیا کو ہمعصر معاشرے اور ادب کا آئینہ بنانے میں قلمی تعاون بھی دیں اور اس کے مشمولات کو مزید وسعت دینے کے لیے قابل عمل تجاویز سے بھی نوازیں۔

آپ کا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

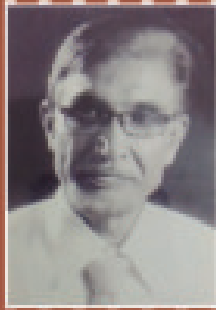

ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان

بی اماں

ایک عظیم مجاہدۂ آزادی

تحریک آزادئ ہند میں خواتین کی شمولیت نے بہت ہی اہم اور نمایاں رول ادا کیا ہے۔ اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے مہاتما گاندھی نے 1930 میں خواتین کی شمولیت کو ضروری اور اہم سمجھا اور تحریک آزادئ ہند میں انھیں شریک کیا۔ مسلم خواتین نے بھی آزادی کی جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 1857 کی پہلی جنگ آزادی میں سبز پوش خاتون ''عزیزن'' بیگم حضرت محل کے کارہائے نمایاں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔

1930 سے قبل تحریک آزادی میں ایک خاتون مجاہدۂ آزادی کا نام لیا جاتا ہے جو تاریخ میں 'بی اماں' کے نام سے مشہور ہے۔ 'بی اماں' مولانا محمد علی جوہر اور شوکت علی جنھیں دنیا علی برادران کے نام سے جانتی ہے کی والدۂ محترمہ تھیں۔ 'بی اماں' تحریک آزادی میں حصہ لینے والی پہلی مسلم خاتون تھیں۔ انھیں قوم وملک کی محبت کا جذبہ وراثت میں ملا تھا۔ ان کے آباء و اجداد کا تعلق مغل دربار سے تھا۔ پہلی جنگ آزادی 1857 میں انگریزوں نے ان کے والد پر مقدمہ دائر کرکے پھانسی کی سزا دی تھی۔

'بی اماں' کے نام کے متعلق دو رائے ہیں۔ طالب الہاشمی اپنی تصنیف میں رقم طراز ہیں:

''محترمہ آبادی بیگم، جنھوں نے تاریخ میں 'بی اماں' کے نام سے شہرت پائی۔ ایک پکی مومنہ اور نہایت عظیم خاتون تھیں۔ مرحوم اکبر رحمانی اور دیگر مصنفین نے بھی آبادی بیگم لکھا ہے۔ اس کے برخلاف محترم سلیم ابن نصیر مالیگاؤں اپنے مضمون میں یوں رقمطراز ہیں:

'ہندوستان کی جنگ آزادی میں مردوں کے دوش بدوش عورتوں نے بھی حصہ لیا تھا۔ اس وقت کی تمام عورتوں میں عابدی بیگم جو بی اماں کے نام سے مشہور تھیں ان کا نام سب سے زیادہ نمایاں ہے۔

دوسری جانب ماہنامہ 'عالمی سہارا' نوئیڈا بھی عابدی بیگم عرف 'بی اماں' کے شواہد پیش کرتا ہے۔ (عالمی سہارا ڈیسک) لیکن اکثریت 'آبادی بیگم عرف بی اماں' کے نام سے یاد کرتی ہے۔ بی اماں کی ولادت 1852

میں امروہہ ضلع مراد آباد میں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے آباء و اجداد کا تعلق مغل دربار سے تھا۔ 1857 میں جب آبادی بیگم صرف پانچ سال کی تھیں، اہل خاندان کو سنبھل جانا پڑا۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزی سرکار نے ان کے والد محترم کو گرفتار کیا اور مقدمہ چلا کر پھانسی کی سزا دی۔ بی اماں کی شادی رام پور کے ایک آفیسر عبدالعلی خاں سے ہوئی تھی۔ بقول طالب ہاشمی: 'ان سے سات بچے ہوئے۔ چھ لڑکے اور ایک لڑکی۔ 1880 میں عبدالعلی خاں نے وفات پائی اور بی اماں نوجوانی میں ہی بیوہ ہوگئیں۔ بی اماں نے اپنی سرپرستی میں مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر اور دیگر بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ انھیں اچھے اخلاق و عادات اور اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا۔ یہ وہی علی برادران ہیں جنھیں دنیا مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کے نام سے یاد کرتی ہے۔ مولانا شوکت علی نے گریجویشن کیا اور مولانا محمد علی جوہر نے آکسفورڈ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ مولانا محمد علی ہندوستان کے اولین انگریزی صحافی تھے۔ جن کی انگریزی قابل رشک تھی۔ انھوں نے 1912 میں اردو روز نامہ 'ہمدرد' جاری کیا۔

مولانا محمد علی نے 1904 سے صحافت کا آغاز کیا۔ 1904 میں 'گپ' کے نام سے الہ آباد سے پندرہ روزہ رسالہ جاری کیا۔ 1911 میں کلکتہ سے انگریزی اخبار 'کامریڈ' نکالا۔ 1912 میں 'ہمدرد' جاری کیا۔ 1914 میں جنگ عظیم اول کا آغاز ہوا۔ مولانا نے اسی دوران کامریڈ میں انگریزی اخبار ٹائمز لندن کا جواب لکھا۔ یہ اداریہ سرکار انگریزی کے خلاف تھا۔ اس کے شائع ہوتے ہی سرکار انگریزی نے اخبار کی ضمانت ضبط کرلی اور مولانا کو نظر بند کر دیا۔ 22 اپریل 1915 کو رام پور میں نظر بند ہوئے اور آخر 28 دسمبر 1919 کو رہا ہوئے۔ مولانا دو بار داخل زنداں ہوئے۔ ان کی اسیری کی کل مدت تقریباً سات سال ہوتی ہے۔ اسی طرح مولانا شوکت علی بھی سرکار انگریزی کی مخالفت میں مصروف رہے اور داخل زنداں ہوئے۔ بوڑھی ماں کے حوصلے بلند ہی رہے۔ بیٹوں کی ہمت افزائی اور حوصلہ افزائی میں کمی نہیں آئی۔ ان کے خیالات کی عکاسی یٰسین نامی شخص نے نظم 'صدائے خاتون' میں کی ہے۔ جس میں بی اماں کے جذبات کی عکاسی نظر آتی ہے۔ نظم 'صدائے خاتون' کے چند ملاحظہ فرمائیں۔

صدائے خاتون

بولیں اماں محمد علی کی   جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہے شوکت علی بھی   جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ہو تمھیں میرے گھر کا اجالا   تھا اسی واسطے تم کو پالا
کام کوئی نہیں اس سے اعلیٰ   جان بیٹا خلافت پہ دے دو
صبر سے جیل خانے میں رہنا   جو مصیبت پڑے اس کو سہنا
کیجیو اپنی اماں کا کہنا   جان بیٹا خلافت پہ دے دو
بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا   کلمہ پڑھ کر خلافت پہ دے دو
پورا اس امتحاں میں اترنا   جان بیٹا خلافت پہ مرنا
ہوتے میرے اگر سات بیٹے   کرتی سب کو خلافت پہ صدقے
ہیں یہی دین احمدؐ کے رستے   جان بیٹا خلافت پہ دے دو
کالے پانی کو خوش ہو کے جانا   سجدۂ شکر میں سر جھکانا
میں پڑھوں گی خدا کا دوگانا   جان بیٹا خلافت پہ دے دو
پھانسی آئے اگر تم کو جانی   مانگنا مت حکومت سے پانی
بات رکھ لیجیو خاندانی   جان بیٹا خلافت پہ دے دو
حشر میں حشر برپا کروں گی   پیش حق تم کو لے کر چلوں گی
اس حکومت پہ دعویٰ کروں گی   جان بیٹا خلافت پہ دے دو
دین و دنیا میں پاؤ گے عزت   سب کہیں گے شہید خلافت
اے محمد علی اور شوکت   جان بیٹا خلافت پہ دے دو
آج اسلام زند میں آیا   ظلم کفار نے مل کے ڈھایا
چین یاسینؔ ہم نے بھی نہ پایا   جان بیٹا خلافت پہ دے دو

یہ نظم ہر خاص و عام میں مقبول ہوئی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خواتین اس نظم کو اپنی تقریبات میں اور چکی پیستی ہوئی گاتی تھیں۔ اس سے نظم کی مقبولیت کا احساس ہوتا ہے۔ طالب ہاشمی نے اپنی تصنیف میں اس نظم کا شاعر یٰسین نامی شخص لکھا ہے۔ (ص: 607) اسی طرح محترمہ نصرت ناہید صاحب، محترمہ رعنا رحمت اور مصنفین کی اکثریت نے یاسین نامی شخص کا ذکر کیا ہے۔ مقطع میں شاعر کا تخلص ہے۔ ماہنامہ 'نیا دور' لکھنؤ دسمبر 2014 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ یہ نظم 'مادر ہند' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ نظم کے مقطع میں شاعر کا نام یوں شفیق تحریر ہے

سُن لو شفیق کی تم کہانی
اے حسین احمد حق کے پیارے

یہ مقطع شاعر کے متعلق اختلاف پیدا کرتا ہے۔ اس سے قبل یاسین اور دوسرے میں شفیق تخلص نظر آتا ہے۔ شاعر کا نام اور تخلص واقعی توجہ اور تحقیق طلب ہے۔ لیکن اس کی مقبولیت میں کوئی شک نہیں۔ اسی طرح دوسری نظم 'صدائے مظلوم' بھی مقبول تھی۔ جس کے مقطع میں یاسین نامی تخلص پایا جاتا ہے۔ اس کے چند بند ملاحظہ فرمائیں۔ نظم 'صدائے مظلوم' یہ تھی۔

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو
آبروحق کے رستے میں دے دی ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو
تم ہمیں یاد کر کے نہ رونا! آنسوؤں سے نہ دامن بھگونا
مل کے سوراج کا بیج بونا! ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو
کام مل کر خلافت کا کرنا! جز خدا کے کسی سے نہ ڈرنا!
حق کے رستے پہ کچھ کر گزرنا! ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو
جرم ہم نے بس اتنا کیا تھا دین احمدؐ کا فتویٰ دیا تھا
کیا حکومت کا اس میں برا تھا ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو
بات قرآن کی جب بتائی یہ سزا اس کے بدلے میں پائی
مل کے سب دو خدا کی دہائی ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو
ہے سلام آخری یہ ہمارا کر دو یٰسین تم آشکارا
قید میں ہم کریں گے گزارا ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

1921 میں علی برادران اور ان کے رفقا پر کراچی مقدمہ دائر ہوا اور اس مقدمے میں مولانا محمد علی جوہر اور ان کے رفقاء کو دو دو برس کی سزا ہوئی۔ کیونکہ انھوں نے 9 جولائی 1921 کو کراچی کانفرنس میں تقریر کی تھی۔ ان کی تقاریر کو باغیانہ ٹھہرایا گیا تھا۔ یہ بھی قرارداد منظور کی تھی کہ 'ہر مسلمان پر انگریز فوج میں بھرتی ہونا حرام ہے۔'

(کراچی کا تاریخی مقدمہ۔ از: مرزا عبدالقادر بیگ)

اگرچہ مولانا محمد علی اول مرتبہ 1915 میں داخل زنداں ہوئے تھے۔ جنگ عظیم اول کے دوران ایک کتابچہ 'مقدونیہ آؤ اور ہماری مدد کرو'۔ ساتھ ہی کامریڈ میں 'The choice of Turks' کے عنوان سے ایک اداریہ لکھا تھا یہ انگریزوں کے خلاف تھا۔ اس کے شائع ہوتے ہی انگریزی سرکار نے کامریڈ کی ضمانت ضبط کر لی اور مولانا محمد علی کو نظر بند کر دیا۔ 22 اپریل 1915 کو رام پور میں نظر بند کیا گیا۔ وہ دسمبر 1919 تک مختلف جیلوں میں مقید رہے۔ علی برادران دو مرتبہ داخل زنداں ہوئے، ان گرفتاریوں نے بی اماں کو سیاست کی راہ دکھلائی۔ چنانچہ ڈاکٹر خورشید جہاں لکھتی ہیں: 'بی اماں کی سیاسی زندگی کا آغاز اس وقت ہوا جب علی برادران کو قانون تحفظ ہند کے تحت گرفتار کیا گیا۔ مولانا نے اپنے اخبار میں 'لندن ٹائمز' کے ایک اشتعال انگیز مضمون کا جواب دیا تھا۔ انھیں چھندواڑہ میں پہلے نظر بند رکھا گیا، پھر بیتول جیل میں قید کیے گئے۔ بی اماں نے اس وقت فخریہ کہا: 'یہ عزت ان لوگوں کے لیے ہے جن کو خدا اپنے مذہب اور ملک کی خاطر تکلیف برداشت کرنے کی طاقت دیتا ہے۔'

جنگ عظیم اول کے دوران قومی تحریکیں اپنے عروج پر تھیں۔ انگریزوں کا ظلم و ستم بھی بڑھ چکا تھا۔ اسی دوران اہم رہنمایانِ قوم کی گرفتاریاں عمل میں آئیں اور انھیں مختلف جیلوں میں ڈالا گیا۔ 1919 میں جلیاں والا باغ کا سانحہ رونما ہوا۔ 1920 سے تحریک عدم تعاون کا آغاز ہوا۔ بی اماں، گاندھی جی کے ساتھ دورے کیا کرتی تھیں۔ زنانہ کانفرنس ہو یا کوئی جلسہ، بی اماں کی شرکت ضروری تھی۔ ملک میں ہوم رول کا چرچا تھا وہ چھندواڑہ میں تھیں۔ سیرانیم صدر ہوم رول کو لکھتی ہیں: 'میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ جو کچھ مجھ جیسی ضعیف العمر عورت اپنے خدا اور ملک کے لیے کر سکتی ہے کروں گی، مہاراشٹر ہوم رول لیگ کی ممبری کے لیے میں نے اور میری بہو یعنی بیگم محمد علی نے حلف لے لیا ہے۔'

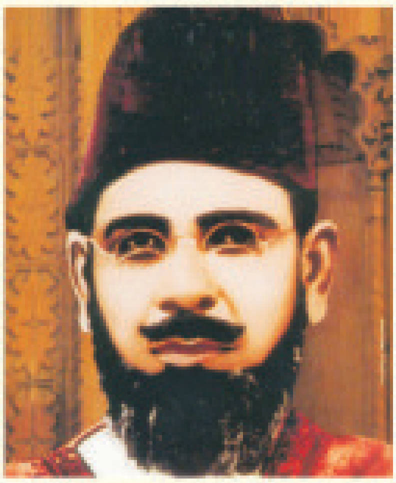

اسی طرح تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون میں گاندھی جی کے ساتھ بھی دورے کیے۔ مسٹر شری کانت نے خدا بخش لائبریری کی فرمائش پر مسٹر تقی رحیم کے تعاون سے بہار آرکائیوز میں محفوظ انگریزوں کے محکمۂ خفیہ کی رپورٹس 'An accout of B Amma's Bihar visit' کے عنوان سے مرتب کیا اور جسے ڈاکٹر انجمن آرا بیگم سابق ریڈر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اس دستاویزی کتاب کا اردو میں ترجمہ بنام 'بی اماں کا دورۂ بہار 1922' کے عنوان سے کیا۔

مختصر یہ کہ بی اماں نے پورے ملک کا دورہ کیا۔ پنجاب، یوپی، مہاراشٹر، ممبئی، خاندیش وغیرہ مقامات پر گئیں۔ مرحوم اکبر رحمانی سابق مدیر اعلیٰ 'آموزگار' جلگاؤں نے اپنے مضمون میں تفصیلی ذکر کیا ہے۔

آپ اندازہ لگایئے کہ ضعیفی میں سیاسی دوروں کی آمد و رفت کتنی مشکل ہوتی ہے۔ تھکاوٹ لازمی ہے، اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر

محمد اطہر مسعود خان لکھتے ہیں: 'بی اماں نے خلافت تحریک کی قیادت بہت طویل عمر میں سنبھالی تھی۔ 73 کی عمر، وہ عمر ہوتی ہے جب زندگی کے بیشتر ولولے ماند پڑ جاتے ہیں اور جذبات میں اضمحلال آ جاتا ہے لیکن بی اماں کے اندر جوش و جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنے دور کی پہلی مسلم خاتون تھیں جنھوں نے بڑھ چڑھ کر عملی سیاست میں حصہ لیا تھا۔ یہ ان کے کردار کی عظمت تھی کہ انھوں نے اپنے دونوں بیٹے ہندوستان کے سپرد کر دیے۔ اس عظیم خاتون نے لوگوں کے پژمردہ دلوں میں نئی روح پھونکنے کے لیے پورے ملک کا دورہ کیا اور جا بجا جلسے کیے۔ انھوں نے خواتین کو منظم کیا۔ انگریزوں کے خلاف جب بدیسی مال کا بائیکاٹ کیا گیا تو بی اماں نے کوشش کی کہ ہر گھر میں چرخے کا چلن عام ہو جائے۔ وہ بذاتِ خود کھدر اور ململ کے علاوہ کوئی لباس استعمال نہ کرتیں۔ بی اماں نے اپنے بیٹوں کے ساتھ اپنی بہو اور دوسرے بچوں میں قربانی کے جذبات بیدار کر دیے۔' (نیا دور، لکھنؤ، دسمبر 2014، ص: 41)

30 دسمبر 1921 کو احمد آباد میں کل ہند زنانہ کانفرنس بی اماں کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ جس میں ملک کی ہزاروں خواتین کے ساتھ مسز گاندھی کستور با جی، مسز سروجنی نائیڈو، شریمتی انسیا بائی، محترمہ سری دیوی چودھرائن، بیگم محمد علی، بیگم ڈاکٹر انصاری، نشاط النساء بیگم حسرت موہانی، بیگم خواجہ صاحب، بیگم ڈاکٹر کچلو جو قابلِ ذکر ہیں شریکِ اجلاس رہیں۔ ان خواتین لیڈروں کی تقریروں کے بعد صدرِ کانفرنس بی اماں نے اپنی پر مغز اور پر زور تقریر کے پھول برسائے۔ 'اچھی اور پیاری بہنو! ہمارا پہلا فرض ہے کہ ہم خدا کے ساتھ سچے رہیں اور اپنے عقیدوں پر مضبوط اور استوار۔ سنو! جب خدا کے ساتھ وفادار نہ ہو، وہ کسی کے ساتھ وفادار نہیں رہ سکتا۔ دیکھو برطانیہ کا ہمارے ملک پر حکومت کرنا ہماری آپسی پھوٹ کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی ایک ہو جائیں اور اپنے ملک کی آزادی کے لیے والنٹیر کی حیثیت سے جماعت میں بھرتی کرائیں۔ اپنے آپ کو اللہ کی فوج کا ایک سپاہی سمجھیں اور اب ہم عیش پرستی سے کنارہ کش ہو کر ملکہ نور جہاں، سلطانہ بی، چاند بی بی، رانی لکشمی بائی، محترمہ زیب النساء، شریمتی اہلیہ بائی اور شریمتی پاربتی جی کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔ پیاری بہنو! تمھارے درمیان میں سیتا، زیب النساء اور حضرت زینبؓ کے نقشِ قدم پر چلنے والی عورتیں موجود ہیں، جن کے شوہر یا پتی شہید کر دیے گئے ہیں یا قید خانوں میں ڈال دیے گئے ہیں۔ تمھارے درمیان میں حضرت بی بی فاطمہ الزہرہؓ اور کنسکا کے نقشِ قدم پر چلنے والی بہنیں موجود ہیں۔ جن کے پیارے پیارے بچوں نے اپنے کو دھرم اور ملک کی قربان گاہ پر خوشی خوشی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ میں تم پر زور ڈال کر کہتی ہوں کہ پروردگارِ عالم کے سوا کسی سے نہ ڈرو لیکن اس کے ساتھ کسی وقتی خیال سے مرعوب نہ ہونے دو۔ قید خانوں سے خوف نہ کھاؤ اور نہ ہی اپنی مذہبی اور سوشل ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤ۔ بہنو! میں تمھیں نصیحت کروں گی کہ جذبات کی رو میں بہہ کر خود کو گرفتار نہ کراؤ اور اگر ایسا وقت آ بھی جائے تو اس سے بھاگو بھی مت۔ تمھیں قرآن پاک اور پوتر شاستر کا پابند رہنا چاہیے۔ یاد رکھو کہ جب ہمارے ملک کے کل مرد جیل خانوں میں چلے جائیں گے تو اس وقت آزادی کا پرچم ہم کو تم کو ہی لہرانا ہوگا۔'' (حسرت موہانی کی ڈائری۔ ص: 107 اور 108)

مختصر یہ کہ بی اماں کا تحریکِ آزادی میں اہم کردار رہا ہے۔ تحریکِ جنگِ آزادی میں حصہ لینے والی پہلی مسلم خاتون اور وہ شیر دل خاتون تھیں۔ بلا خوف و خطر اپنا کام انجام دیتی تھیں۔ اسی تعلیم سے اپنے بچوں کو سنوارا تھا۔ علی برادران بہ بانگِ دہل سرکارِ انگریزی کے خلاف آگ اگلتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر نے گول میز کانفرنس میں بڑی بے باکی کے ساتھ کہا تھا: 'آج میں جس مقصد کے لیے یہاں آیا ہوں وہ یہی ہے کہ میں اپنے ملک کو اسی حالت میں واپس جاؤں گا جبکہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو۔ اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر مجھے یہاں قبر کی جگہ دینا پڑے گی...... میں کامل آزادی کے عقیدے کا پابند ہوں۔''

اسی طرح مولانا شوکت علی کی تقاریر اور کراچی مقدمہ 1921 کے بیانات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا بہت ہی بے باک مقرر تھے اور مقدمہ کے بیانات بھی دو ٹوک ہوتے تھے۔ وہ کہتے تھے: 'اگر کوئی ہمارا دشمن ہے تو وہ ہے انگریز'...... 'مسلمانوں کو انگریزی نوکری کرنا حرام ہے' وغیرہ۔ (کراچی کا تاریخی مقدمہ۔ مرزا عبدالقادر بیگ۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ)

بی اماں تو ان شیروں کی شیرنی ماں تھی۔ بڑی شیر دل خاتون تھیں۔ ان کی تقاریر بڑی شعلہ بیان اور سحر انگیز ہوتی تھی۔ وہ ایک اچھی مقرر تھیں۔ ان ہی صفات کی وجہ سے مختصر مدت میں ہر خاص و عام میں مقبول ہوئیں۔ صرف چند قدیم تاریخی اوراق میں کارہائے نمایاں پوشیدہ ہیں۔ ہمیں اس مجاہدۂ آزادی کے کارناموں کو منظرِ عام پر لانے کی ضرورت ہے تاکہ نئی نسل ان کے کارناموں سے واقف ہو جائے کہ خواتین نے بھی قوم و ملک کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔

●●●

ایم ودود ساجد

شاباش ام الخیر

2011 میں جب ہندی میڈیم سے آنے والی راجستھان کی ایک عجیب الخلقت اور پریشان حال لڑکی انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں منعقد پرسنالٹی ڈویلپمنٹ ورکشاپ کے اسٹیج پر گرتی پڑتی پہنچی تو نیچے بیٹھے ہوئے تین سو سے زیادہ اسٹوڈینٹس اسے دیکھ کر ہنس پڑے۔ان نوجوانوں کی ہنسی بڑھتی چلی گئی۔ورکشاپ کے مقبول عام استاذ محمد منور زماں نے اس انتہائی نظم وضبط کے حامل پروگرام میں پہلی بار ایسی صورت حال کا سامنا کیا تھا۔لیکن آج ورکشاپ کے 21ویں دن وہ ہر قیمت پر دو چھوٹی اور کمزور ٹانگیں رکھنے والی اس لڑکی کو اسٹیج پر انگریزی میں بولتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔اس سے پہلے 20 دنوں تک یہ لڑکی اسٹیج پر جانے کے لئے اپنے حواس جمع کرتی تھی لیکن طلبہ کے ہجوم میں پیچھے رہ جاتی تھی۔آج اس نے پوری طاقت کے ساتھ اپنا ہاتھ لہرایا تھا اور استاذ نے باقی سب کو روک کر صرف اسی کو اسٹیج پر آنے کی اجازت دی تھی۔جب اسے دیکھ کر سب بلند آواز میں قہقہے لگانے لگے تو استاذ نے صورت حال کی نزاکت کو محسوس کرنے کے باوجود اس کیفیت سے مقابلہ کیلئے اس معذور لڑکی کو اکیلا چھوڑ دیا۔اسٹیج کے وسط میں پہنچنے کے بعد اس نحیف ونزار لڑکی نے ایک نظر اپنے استاذ پر ڈالی اور ہمت رکھنے کا اشارہ پا کر دوسری نظر سامنے بیٹھے ہوئے تین سو سے زیادہ طلبہ پر ڈالی۔اس نے پوری طاقت سے کہا کہ----آپ سب میرے ہم جماعت ہو۔ہنسو خوب ہنسو۔میں چاہتی ہوں کہ ورکشاپ کے باقی 20 دن بھی آپ سب مجھ پر یوں ہی ہنسو۔مجھے یہ سب منظور ہے۔لیکن میں یہ نہیں چاہتی کہ میری زندگی کے باقی ایام میں یہ دنیا مجھ پر ہنسے۔''

جی ہاں!یہ قصہ اسی لڑکی کا ہے جس نے حال ہی میں یونین پبلک سروس کمیشن کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی ہے۔ام الخیر کی کہانی کوئی دیومالائی قصہ معلوم ہوتی ہے۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کی جو کہانی آپ زیر نظر سطور میں پڑھیں گے وہ حرف بہ حرف صحیح اور مستند ہے۔جب کلاس کے استاذ نے یہ معاملہ میرے سامنے رکھا تو میں نے ان سے درخواست کی کہ اس لڑکی کی خصوصی نگہداشت رکھئے۔ضرورت پڑنے پر اسے وہیل چیر بھی فراہم کیجئے۔ورکشاپ کے باقی 19 دنوں میں اس کا بہتر طور خیال رکھا گیا۔ام الخیر بچپن میں ہی نہ صرف ہڈیوں کے گھلنے یا خطرناک حد تک کمزور ہونے کی بیماری کا شکار ہوگئی تھی بلکہ اضافی طور پر اس کا قد بھی انتہائی کم نکلا۔انگریزی میں ایسے لوگوں کو DWARF یعنی بونا کہتے ہیں۔اسلامک سینٹر کے اسٹیج پر اس کے پستہ قد کو دیکھ کر ہی اس کے ساتھی اس پر ہنسے تھے۔لیکن اس نے جب منہ کھولا تو ہال میں موجود تمام قد آور اسٹوڈنٹس کو اخلاقی طور پر پست کر دیا۔اخلاق کی اسی بلندی نے ام الخیر کو ساری پستیوں کو عبور کرنے کا حوصلہ بخشا تو آج وہ ہندوستان کے سب سے باوقار سول سروسز کے امتحان میں کامیابی سے ہم کنار ہوئی۔

گوکہ اس کا رینک 420 ہے تاہم معذوری کے زمرہ میں وہ میرٹ میں سب سے اوپر ہے۔لہٰذا اسے آئی اے ایس کا زمرہ ملنا طے ہے۔ام الخیر

17 فریکچرس سے متاثر ہے اور اب تک سات سرجریز ہو چکی ہیں۔۔۔۔

ام الخیر جب محض دس مہینہ کی تھی تو کوئی گھریلو تنازعہ ہوا اور اس کی والدہ کو چھوڑ کر اس کے والد نے دوسری شادی کر لی۔ راجستھان کے ایک گاؤں پالی میں اب ام الخیر اپنی تنہا ماں کے لئے سکھ کی بجائے مزید دکھ کا سامان بن گئی۔ لیکن ماں تو ماں ہوتی ہے۔ اس نے ہمت نہیں ہاری اور محنت کر کے ام الخیر کی پرورش کی۔ لیکن اسی دوران ماں سخت بیمار ہو گئی اور یہاں تک کہ دماغی توازن بھی قائم نہ رہا۔ ام الخیر کی دادی نے اپنے ناخلف بیٹے کو سخت سست سنائی اور اس پر راضی کر لیا کہ وہ کم سے کم ام الخیر کو اپنے پاس دہلی لے جائے اور اس کی تعلیم و تربیت کو آگے بڑھائے۔ دہلی آنے کے بعد ام الخیر ایک طرف جہاں اپنی اصل ماں سے محروم ہو گئی وہیں دوسری طرف سوتیلی ماں کی بدسلوکی کا شکار ہو گئی۔ شام کو جب ام الخیر پڑھنا چاہتی تو اس کی سوتیلی ماں گھر کے تمام بلب بند کرا دیتی۔ 2003 میں جب ام الخیر آٹھویں کلاس میں تھی تو اس کی اصل والدہ بھی اس دنیا سے کوچ کر گئیں۔ 2004 میں ام الخیر نے اپنی سوتیلی ماں کا گھر بھی چھوڑ دیا اور دہلی کے ترلوک پوری علاقے میں کرایہ پر رہنے لگی۔ اس نے بچوں کو ٹیوشن پڑھایا اور اپنی تعلیم جاری رکھی۔ اس دوران اسے کسی نے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں منعقد ہونے والی سالانہ پرسنالٹی ڈویلپمنٹ ورکشاپ میں داخلہ لینے کا مشورہ دیا۔ ام الخیر نے انتہائی نامساعد حالات میں ہندی میڈیم سے تعلیم حاصل کی تھی لیکن یہاں انگریزی کا ماحول دیکھ کر وہ احساس کمتری کا شکار تھی اور چاہتی تھی کہ وہ انگریزی زبان پر عبور حاصل کر لے۔ دہلی میں اس طرح کے کورسز کی سینکڑوں مہنگی دوکانیں کھلی ہوئی ہیں۔ ام الخیر کے بس میں نہیں تھا کہ وہ ایسی کسی مہنگی دوکان سے انگریزی کی تربیت حاصل کرے۔ اسلامک سینٹر میں اس نے محض چالیس روزہ ورکشاپ سے جو کچھ حاصل کیا اس نے ام الخیر کی زندگی کا رخ بدل کر رکھ دیا۔ جب اس نے کئی مرکزی وزیروں کی موجودگی میں آخری دن کی تقریب میں انگریزی میں تقریر کی تو اس کے قد کی پستی اس کے خیالات کی بلندی کے آگے کہیں گم ہو کر رہ گئی۔ اس کے خیالات سن کر سب حیرت زدہ رہ گئے۔ اس نے کہا کہ میں نے یہاں سیکھا ہے کہ زندگی کتنی ہی مشکل ہو ہمت نہیں ہارنی چاہئے۔ اس نے کہا کہ جو کچھ میں نے یہاں سیکھا ہے اس کی روشنی میں 'میں بھی کل کی افسر ہو سکتی ہوں۔ اس نے کہا کہ انسان کا ظاہری قد اس کی شخصیت کا معیار طے نہیں کرتا بلکہ انسان کا باطنی قد اس کی شخصیت کا معیار طے کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ پستہ اور دراز قد ہونا انسان کے اپنے ہاتھ میں نہیں ہے لیکن اپنے اخلاق کو بلند کرنا یقیناً انسان کے بس میں ہے۔

مجھے یاد ہے کہ جب ام الخیر نے مئی 2011 کی مذکورہ تقریب میں شاندار انگریزی میں تقریر کی اور بیسٹ نو بلائٹ 2011 ایوارڈ کی مستحق قرار پائی تو مرکزی وزیر ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے محض چالیس دنوں میں حاصل کردہ تربیت کا امتحان لینے کی غرض سے اس سے کہا کہ بریانی بنانے کی ترکیب انگریزی زبان میں بتایئے۔ اس کا جواب سن کر فاروق عبداللہ لاجواب ہو گئے۔ اس نے انگریزی میں کہا کہ سر! میں نے جھگیوں میں کس مپرسی کی زندگی گزاری ہے۔ میں آپ کو صرف دال بنانے کی ترکیب بتا سکتی ہوں' بریانی بنانے کی نہیں۔ بریانی بنانے کی ترکیب وہ بتائے جس نے کبھی بریانی بنائی اور کھائی ہو۔" 2012 میں ام الخیر کو معذوروں کی بین الاقوامی کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی کے لئے جنوبی کوریا جانے کا موقع ملا۔ 2013 میں قومی خواتین کمیشن نے اسے ایوارڈ برائے غیر معمولی خاتون سے نوازا۔ 2014 میں حکومت جاپان نے یک سالہ لیڈر شپ ٹریننگ پروگرام کیلئے جاپان مدعو کیا۔ اس وقت بھی ام الخیر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر رہی ہے۔ جب میں نے سول سروسز کے نتائج آنے کے بعد ام الخیر کو فون کر کے مبارکباد دی تو ام الخیر رو پڑی۔ اس نے کہا کہ سر! آپ تو عربی داں ہیں۔ ام عربی میں ماں کو کہتے ہیں اور خیر تو آپ جانتے ہی ہیں۔ یہ نام تو میرا ہے لیکن دراصل ام الخیر تو میری ماں تھی۔ اور آج جب میں دنیا بھر کے معذوروں کو یہ پیغام دینے کے لائق بنی ہوں کہ ظاہری قد کی پستی کامیابی کی بلندیوں تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے تو اصل اقدار کی حامل میری ماں یہ سب دیکھنے کیلئے موجود نہیں ہے۔

آزاد ہندوستان میں جب سے سول سروسز کے امتحانات شروع ہوئے ہیں مسلم نوجوانوں کی سب سے زیادہ تعداد پچھلے سال 38 آئی تھی۔ 38 تک یہ تعداد بتدریج پہنچی تھی لیکن اس بار 38 سے 50 تک پہنچنا ایک غیر معمولی حصولیابی ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑی حصولیابی یہ ہے کہ غلام اور آزاد ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلی بار ہوا ہے کہ کسی معذور پستہ قد مسلمان لڑکی نے آئی اے ایس کا زمرہ حاصل کیا ہو۔ ام الخیر کی کامیابی نے لڑکیوں کو ایک راستہ دکھایا ہے۔ ایسی نہ جانے کتنی ام الخیر ہوں گی جو رو نمائی کو ترستی ہوں گی۔ ہم اپنے درمیان ایسی ام الخیر کو تلاش کریں اور کچھ نہ سہی تو کم سے کم زبان سے ہی ان کا حوصلہ بڑھا کر ترقی کی اس سیڑھی پر چڑھنے کا راستہ دکھائیں جس سیڑھی کو راجستھان کی اس ام الخیر نے عبور کر کے دکھا دیا۔

شاعرات کے منتخب اشعار

جاتے جاتے لوگوں کو بیزار نہ کرنا بہتر ہے
اپنے دکھ ہم اپنی ہی دہلیز کے اندر بو جائیں

•••

یہ دیکھنے کے لیے بار بار لوٹتی ہوں
کہ کاش تو مرے جانے پہ سوگوار ملے

عمیرا رحمٰن

•••

لے کے چلو میں گرا دیں پانی
پیاس میں اتنی تو رعنائی ہو

•••

خزاں کے بیج زمینوں میں بو کے بیٹھے ہیں
اور انتظار کسی موسم بہار کا ہے

نسیم سید

•••

مجھے شریک بہاراں کیا ہے ٹھہرو تو
میں اپنے خوں میں نہا کر ذرا نکھر جاؤں

•••

میں نے اک بوند جو مانگا تو عجب قحط پڑا
خون بازاروں میں جیسے کبھی بکتا ہی نہ تھا

عشرت آفرین

•••

جاں دے کے بھی میں بار کرم سے دبی رہی
حالانکہ میں نے قرض بہت کچھ ادا کیے

•••

نہ جانے کس طرح ہر چال الٹی ہو گئی بازی
بڑی ترتیب سے ہم نے بھی مہرے سجائے تھے

ام ہانی

•••

کبھی خموش کبھی سامنے ہیں محو کلام
تصورات پہ پھر آپ چھا رہے ہیں یہاں

•••

خود بھی شاید نہ پا سکو گے تم
ہم نے جو بات تم میں پائی ہے

اسماء سعیدی

رہنے لگا دل اس کے تصور سے گریزاں
وحشی ہے مگر میرا کہا مان گیا ہے

•••

احتیاطیں تھیں مناسب جب سماعت تھی بجا
اب تو اپنے دل کی سب کہنے لگے دیوار سے

نور جہاں ثروت

•••

میں نظر آؤں ہر اک سمت جدھر سے چاہوں
یہ گواہی میں ہر اک آئینہ گر سے چاہوں

•••

ستم شناس ہوں لیکن زباں بریدہ ہوں
میں اپنے پیاس کی تصویر بن کے زندہ ہوں

کشور ناہید

•••

حسرت دید سلامت کہ مری آنکھوں میں
جب بھی چاہوں تری تصویر نظر آئے گی

•••

دیوار و در اداس ہے زنداں کے ساتھیو
زنجیر ہی ہلاؤ کہ دلبستگی رہے

سیما نظمی

•••

یہ سمجھ کہ چلتی ہوں تیرا نقش پا ہوگا
میں جہاں سے گزروں گی تیرا سامنا ہوگا

پیار کرنے والوں کا صرف ایک صحرا ہے
سارے شہر اس کے ہیں ساری بستیاں اس کی

مظفر النساء ناز

•••

کیا جانے چلے آئے ہیں کس راہ پہ شبنم
ہم دوش پہ یہ بار مہ و سال اٹھائے

•••

بے چہرہ ہوئے آج مگر کس سے شکایت
آئینہ اسی کا ہے تو حیرت بھی اسی کی

صدیقہ شبنم

حلیمہ فردوس

نسائی شاعری اور صنفی مساوات

اردو کی ادبی تاریخ میں نسائی شعری سرمایے کو عرصۂ دراز تک قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ شعری ایوان کے یہ چراغ اہلِ ادب کی نگاہوں سے محروم رہے۔ اس بے اعتنائی کے دیگر جوازات کے علاوہ سماجی پابندی بھی سب سے اہم جواز تھی۔ آج تانیثیت کے حوالے سے نسائی ادب کے سماجی، تاریخی، تہذیبی اور لسانی پہلوؤں پر غور کیا جا رہا ہے، ایسے میں نسائی شاعری پر گفتگو کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ جب بات اردو شاعری میں صنفی مساوات کی ہوتی ہے تو سارا منظر نامہ آنکھوں کے آگے گھوم جاتا ہے۔ تفصیل میں گئے بغیر صرف نسائی شاعری پر گفتگو کرنا میرا مقصد ہے۔ ایک عرصے تک شعری میدان میں نسائی نقوش نہیں ملتے۔ بھلا ہو محققین کا جنھوں نے شاعرات سے متعلق لکھے گئے دو سو تذکروں سے چند ایک کی فہرست مرتب کی۔ اہلِ ادب کے اس رویے کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ''نسائی شاعری گم شدہ آواز اور گم شدہ پرواز کا نام ہے۔'' پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ لطف النسا امتیاز اور ماہ لقا بائی چندا جیسے ناموں کو حاشیے پر رکھا گیا۔ سماج میں موجودہ روایت کے تحت عموماً شاعرات پر متشاعر ہونے کا الزام عائد کیا جاتا رہا۔ جس میں کچھ حقیقت ہوتو ہو، دراصل یہ خیال خود صنفی تفریق کا نتیجہ تھا۔ چھ ہزار اشعار پر مشتمل مثنوی گلشنِ شعرا کی خالق پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ لطف النسا امتیاز کے مندرجہ ذیل اشعار سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے۔ امتیاز کا کلام اس کی شعری صلاحیتوں کا صداقت نامہ ہے:

عجب قصہ نادر بنائی ہے آج
جہاں میں بہت ہوگا اس کا رواج
ترا جو تخلص ہے اب امتیاز
ہے سب اہلِ ہنروں میں تو شاہ باز

یہ محض شاعرانہ تعلّی نہیں بلکہ سرِ عام اپنی صلاحیتوں کا اعتراف ہے۔ یہ خود اعتمادی اور شعری صلاحیتیں امتیاز کے رفیقِ حیات کی صحبت کا نتیجہ تھیں۔ اس نے مثنوی میں اپنے مرحوم شوہر کے شاعرانہ مرتبے اور عشق کا برملا اظہار کیا، گویا یہ صنفی مساوات کا پہلا ثبوت ہے۔ اس دور کا ایک اہم نام ماہ لقا بائی چندا کا ہے۔ اس کے کلام میں صنفی مساوات کا ذکر نہیں ملتا البتہ اس کے لہجے سے تفاخر جھلکتا ہے، وہ کبھی احساسِ کمتری کا شکار نہیں رہی:

چندا کے دیکھنے کی جو خواہش کرے
رکھتا ہے وصف اپنے میں وہ عز و جاہ کا
بویا زمینِ دل میں سدا تخمِ آرزو
نارسائیوں کا نہ دیکھا ثمر کبھی

یہ شاعرانہ گفتگو نہیں ہے۔ محققین نے چندا کی ذہانت، علمیت اور بردباری کا اعتراف کیا ہے۔ ان مثالوں سے قطعِ نظر انیسویں صدی میں جب تعلیمِ نسواں کا غلغلہ اٹھا تو زخ ش یعنی زاہدہ خاتون شیروانیہ نے اپنی شاعری کے ذریعے اردو برادری کو چونکا دیا۔ انھوں نے ایک جانب

عورتوں کی غیرت کو للکارا تو دوسری جانب زعم میں ڈوبے مردوں اور احکام خداوندی کے مبلغوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر عورت کے رتبے او روقار پر مہر لگادی۔

اس دور تک نسائی شاعری میں مرد وزن کے مساوات کا تصور مفقود تھا۔ زخ شیروانیہ نے پہلی باراس حقیقت کی جانب مردوں کی توجہ مبذول کرائی:

مرد و زن مل کے لگا سکتے ہیں وہ کشتی پار
جو خلیج تلاطم میں پڑی ہے بیکار
چھوڑ دے بہر خدا چھوڑ دے انداز ستم

بہرکیف زخ شیروانیہ کو صنفی تفریق مٹانے والی یا صنفی مساوات کی پہلی آواز قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کے بعد تعمیری رجحان رکھنے والی شاعرات کے چند نام جگنو کی طرح چمکتے ہیں لیکن ادا جعفری سے خواتین کی شعری کائنات میں ایک نیا باب وا ہوتا ہے۔ تانیثیت کی حامی کشور ناہید، فہمیدہ ریاض نے صنفی مساوات کا پرچم تھامے ایوان شاعری میں قدم رکھا۔ اس قبیلے سے تعلق رکھنے والی شاعرات کی لمبی فہرست ہے، ان میں سارا شگفتہ، عذرا عباس اور تسیم سید نے کھل کر حمایت کی۔ یہ شاعرات مارشل لا کے دور کی پیداوار ہیں۔ جہاں تک صنفی مساوات کا تعلق ہے نسائی شاعری کی ماہ تمام پروین شاکر کی شاعری میں پیار و محبت سے متعلق مرد کی نفسیات کی باتیں تو ملتی ہیں لیکن صنفی مساوات کے تئیں انھوں نے اجتہادی رویہ نہیں اپنایا۔ ان مجتہدانہ نسائی آوازوں نے مرد کے لیے کتا، بھیڑیا اور عورت کے لیے مکھی اور بلی جیسے غیر شاعرانہ الفاظ کے ذریعے اپنی شعری فرہنگ تیار کی۔ کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور سارا شگفتہ نے نہ صرف صنفی مساوات کی بات کی بلکہ صنف اور جنس کے موضوع پر بلاخوف وخطر اظہار خیال کیا۔ حتیٰ کہ ان کے نام نسائی احتجاج کا استعارہ بن گئے۔ بہرکیف نسائی مزاحمتی شاعری میں صنفی مساوات کی بہ نسبت صنفی امتیاز و تفریق نامساوات کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔

کشور ناہید کا شعری سفر غزل سے شروع ہوا لیکن ان کے سینے میں ابلتے درد کو نثری نظموں میں پناہ ملی۔ مہندی بھرے ہاتھوں کو چھپا کر رکھنے والی شاعرہ یہ کہنے پر آمادہ ہوگئی:

میں اپنے نیلو نیل بدن سے پیار کرتی ہوں/ مگر مجھے تم کبھی جتنی آزادی کہاں دے سکو گے/ تم نے عورت کو کبھی بنا کر بوتل میں بند کرنا سیکھا ہے (قید میں رقص 42-43)

عورت کی بے زبانی، کسمپرسی اور زبوں حالی صنفی تفریق کا نتیجہ ہی تو ہے۔ انتہا یہ ہے کہ مرد ہمیشہ اس کے وجود کو غیر اہم ہی سمجھتا رہا ہے۔ اس دور کی شاعرات نے نسائی تشخص پر زور دیا۔ انھوں نے مرد کو یہ باور کرایا کہ عورت محض آگ بجھانے والی ندی نہیں ہے وہ اپنی سوچ سمندر کی مالک ہے۔ فہمیدہ ریاض کو 'دریدہ بدن' کی نظموں سے شہرت اور بدنامی یکساں طور پر نصیب ہوئی۔ ان کی نظمیں 'مقابلۂ حسن' اور 'اقلیما' جنسی تجربوں کے بجائے اس ترقی یافتہ دور کی عورت کے تئیں برتی جانے والی بربریت کی ترجمان ہیں۔ صنفی تفریق ہی سے اس کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ شاعرہ عورت کے فکری وجود پر زور دیتی ہے۔ نظم 'مقابلۂ حسن' مرد اساس معاشرے کی صارفی سوچ پر کاری ضرب ہے۔ شہناز نبی کی کئی نظمیں جیسے 'پہچان'، 'گمشدگی' اور خوشی میں ایک ایسی عورت سانس لیتی ہے جس کے ذہن میں ہردم سوچ کی لہریں اٹھتی ہیں۔ خصوصاً ان کی نظم 'بھول' میں خواتین کی ذات سے وابستہ چنتیوں کے ظالمانہ رویے کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔

دراصل نسائی تشخص صنفی مساوات کا جز ہے اور نسائی وقار اس تفریق یا امتیاز کو ختم کرنے کا اہم رویہ ہے، خواتین کی شاعری میں شفیق فاطمہ شعریٰ نسائی وقار کی علمبردار شاعرہ ہیں۔ نظم رابعہ تابعہ کی یاد میں اور 'دعائے بانوئے فرعون'، 'بی بی مریم' اس کی مثالیں ہیں۔ شاعرہ نے اسوہ بانو کو ارتقائے آدمیت کا سنگ میل قرار دیا ہے۔ نظم کا مختصر سا اقتباس ملاحظہ ہو:

ارتقائے آدمیت کے اس دور کا آغاز ہے/ جس میں اُسوہ/ بانوئے فرعون کا اسوہ وہ پہلا سنگ میل/ جس پہ اُتری تابش ام الکتاب/ آہ سچائی عجب شے ہے اگر پربت پہ ہو نازل/ تو ہو پربت پارہ پارہ

معاصر شاعرات میں شائستہ یوسف کے کلام میں نسائی وقار کا پرتو صاف جھلکتا ہے۔ شفیق فاطمہ شعریٰ کی طرح شائستہ نے اسلامی تمثالوں سے متعلق کامیاب نظمیں لکھی ہیں۔ صدائے زلیخا، صحراؤں میں اذاں، شرارت، رب ارنی انظر، تطہیر اور 'حاضری' جیسی نظمیں نسائی وقار سے منور ہیں۔ نظم حاضری میں ممتا کی ضوفشانی سے آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں۔ اس نسائی وقار کے آگے صنفی مساوات کا نظریہ بے وقعت نظر آتا ہے۔ حج وعمرہ کا حضرت ہاجرہ کے نام سے منسوب ایک رکن یعنی صفا مروا کا چکر گویا نسائی وقار کا اعتراف ہے۔

شعری میراث کی علمبردار زیدی بہنوں نے کبھی تانیثیت کی ہم نوائی نہیں کی۔ ساجدہ زیدی علی الاعلان صنفی مساوات کا ذکر نہیں کرتیں، البتہ عورت کے مجبور محض تصور کی تردید کرتی ہیں۔

ان کی نظم 'کلیاں نیلا آسمان زنجیریں' میں عورت کی محرومی کا ذکر تو ہے مگر یہ عورت مجبور، مجہول محکوم وجود نہیں رکھتی۔ وہ مدار نور میں مہتاب کی ہم

رقص ہونے کی آرزومند ہے، یہ دورِ حاضر کی ترقی یافتہ عورت کا کردار ہے۔

گرچہ کہ شاعرات نے صنفی تفریق اور صنفی مساوات کا اظہار نثری نظموں کے پیرائے میں کامیابی سے کیا ہے مگر نظموں میں کہیں مزاحمتی لہجہ تو کہیں فلسفیانہ رنگ تو کہیں نفسگی ہے۔ شاعرات غزل کے فن شیشہ گری سے بخوبی واقف ہیں ان کے غزلیہ اشعار میں عورت کی داخلی کیفیت اور ذاتی اُلجھنوں کے علاوہ خود اعتمادی کے اشکارے بھی ہیں، وہ اس عورت کی بات کرتی ہیں جو نہ ابھاگن ہے اور نہ ہی جوگن وہ اپنی قسمت پر آنسو نہیں بہاتی خود کو تنہا نہیں محسوس کرتی وہ ماحول سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے، وہ زندہ رہنے کی خواہشمند ہے وہ توانا لہجے کی مالک ہے، شاعرات نے جہاں جنسی تفریق کو نشان زد کیا ہے وہیں مردوں کو مساوی حقوق کا سبق بھی یاد دلایا ہے، وہ اپنے تشخص کی بات کرتی ہیں وہ اپنے تئیں 'مجبورِ محض' کے تصور کو بے معنی ٹھہراتی ہیں۔ تانیثی بغاوت کے جو شعلے نظموں میں نظر آتے ہیں وہ غزلیہ اشعار میں مفقود ہیں لیکن طنز کی نشتریت برابر برقرار ہے:

کیا میرا زیاں ہے جو مقابل ترے آجاؤں
یہ امر تو معلوم کہ تو مجھ سے بڑا ہے — فہمیدہ ریاض

تعظیم اس کے لیے مخصوص رکھی
وہ جس کو مرے قد کا نکلنا نہیں بھایا — زہرا نگاہ

چھوڑیے پیروں میں کیا لکڑیاں باندھے پھرنا
اپنے قد سے مرا قد شوق سے چھوٹا سمجھیں — بلقیس ظفیر الحسن

عجب ہوں تم میں لگا کر خود اپنے خود کا جوڑ
تلاش کرتی ہوں یہ تم ہو یا مرا قد ہے — عذرا پروین

معاصر خواتین کی غزلوں کا منظر نامہ کچھ علاحدہ نہیں ہے، حیات وکائنات کے مسائل کے علاوہ اس میں عشق کے آب دار موتیوں کی چمک ہے، زندگی کی تلخ سچائیوں کے سنگ ریزوں کا نوکیلا پن بھی ہے، نسائی غزلیہ اشعار میں صنفی امتیاز، مرد کی بالا دستی اور مرد کی فطرت کے تذکرے بھی ہیں یہ غزلیہ اشعار خواتین کے مزاج و مذاق اور منہاج فکر و نگاہ کا نتیجہ ہیں۔ آج عورت مساوات کا دعویٰ کرے نہ کرے وہ اپنے آپ کو پہچان گئی ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

پڑی ہوئی تھی کسی در پہ ٹھیکری کی طرح
میں اٹھ کھڑی ہوئی اور عقل کو ہسار ہوئی (نسیم سید)

بجھا کے رکھ گیا ہے کون طاق نسیاں پر
مجھے اندر سے پھونکے دے رہی ہے روشنی میری (بانو داراب وفا)

مرے بالوں کی چاندی سے گریزاں آج ہے وہ
جسے کل میرا چاندی سا بدن اچھا لگا تھا (مونا شہاب)

سورج کی تیز نظروں کا ہر وار سہہ لیا
شبنم تھی پھر بھی آنکھ میری شبنمی نہ تھی (رفیعہ شبنم عابدی)

وہ ذہن کی سوچ کیا سمجھے بھلا
اس کو تو بس ایک گڑیا چاہیے (زرین یاسین)

مذکورہ بالا اشعار میں عورت کی خودداری اور خود اعتمادی کے علاوہ مرد کی فطرت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ غزل کے کینوس پر خود آگاہ عورت کئی سوال کے جواب تلاش کر رہی ہے۔ بُریدہ دست آذر کی لڑکی اور بے یقینی حوا کی خلق کردہ مخلوق معاشرے سے تفریق کا حساب مانگ رہی ہے، نسائی غزلوں کی یہ زبان، یہ استعارے اس کے اپنے ہیں۔ یہ شعری سرمایہ آدھے مرد کی دیومالا ہے، جیسے:

فلیٹ کی چابی، صوفہ، بستر کمرے کی ہر ایک شے
اس میں بسنے والا آدھا مرد مگر کب میرا ہے
(شہناز نبی)

آتی تھی ہمیں رفو گری بھی
ایک دوسرے کا لباس تھے ہم (پروین شاکر)

کھڑی ہے فکر کے آذرکدے میں
بُریدہ دست آذر کی وہ لڑکی (عشرت آفرین)

میں بے یقینی حوا کی خلق کردہ ہوں
میرے خمیر میں شک آگہی کی ابجد ہے (عذرا پروین)

نسائی شاعری کا معتد بہ حصہ صنفی تفریق کی گواہی دے رہا ہے، مگر کبھی کبھار شاعرات دھیمے لہجے میں صنفی مساوات کی حقیقت سمجھانے لگتی ہیں۔ فاطمہ حسن کی گزارشات ملاحظہ ہوں:

آنکھوں میں نہ زلفوں میں نہ رخسار میں دیکھیں
مجھ کو میری دانش مرے افکار میں دیکھیں
پوری نہ ادھوری ہوں نہ کمتر ہوں نہ برتر
انسان ہوں انسان کے معیار میں دیکھیں

آج ہمارے سماج میں صنفی مساوات کی باتیں ہو رہی ہیں اور صنفی تفریق کو مٹانے کی کوششیں جاری ہیں، ہمارے شعر و ادب کا یہ ایک اہم موضوع بن گیا ہے، مگر "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" والا معاملہ ہے، یہ ایسا درد ہے جس کی دوا بھی ہے اور وہ لا دوا بھی، اس تعلق سے بس اتنا کہا جا سکتا ہے "درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا"۔

جدو جہد آزادی میں خواتین کا حصہ

ڈاکٹر سمیرا مومن

''تاریخ جنوں یہ ہے کہ ہر دور خرد میں
اک سلسلۂ دار و رسن ہم نے بنایا

جدوجہد آزادی ہند میں خواتین کا جو حصہ رہا اس کا جائزہ لینا ضروری بھی ہے اور وقت کا تقاضہ بھی کہ آج اس دور میں جب وہ مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کررہی ہیں۔ تاریخ کے اس سنہرے دور سے بھی پوری طرح واقفیت رکھیں اور نئی نسل کی لڑکیاں ان کے کارہائے نمایاں کو آدرش مان کر ملک کے لیے جینا اور مرنا سیکھیں۔ ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے میں جہاں مرد پیش پیش رہے۔ وہیں خواتین نے بھی اپنی جان کی بازی لگادی۔ گاندھی جی، پنڈت نہرو، شہید بھگت سنگھ، اشفاق اللہ خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، منگل پانڈے، مولانا حسرت موہانی، رفیع احمد قدوائی، سردار ولبھ بھائی پٹیل، ویر ساورکر، سوریہ سین، سبھاش چندر بوس، ٹیپو سلطان وغیرہ کا نام ہندوستان کی تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھا جاتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں بے شمار جگہوں پر ان کی قربانیوں کے تذکرے ملتے ہیں ان مجاہدین آزادی کے دوش بدوش سینکڑوں جرات مند خواتین بھی تھیں جن کے سینے جذبہ حب الوطنی سے سرشار تھے اور اپنے وطن عزیز کی آزادی کے لئے اپنی جانیں دینے کیلئے وہ خواتین تیار تھیں۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ان کا ذکر شاذ ہی کیا جاتا ہے۔ یہاں ان خواتین کے بہادری کے کارناموں کو مختصراً ایک جگہ جمع کیا گیا ہے۔ جن کے نام اب تک پردۂ اخفا میں تھے۔ جنگ آزادی میں خواتین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ان کی قربانی اور ان کے جذبے سے متاثر ہوکر' گاندھی جی' نے کہا تھا:

''عورت زندگی کا سر چشمہ ہے۔
عورت خدا کی عظیم ترین تخلیق ہے
اپنی عملی دنیا میں اس کا مقام اعلیٰ ترین ہے''

''جد و جہد آزادی ہند میں خواتین کا حصہ'' نہ صرف ہندوستانی خواتین کی وطن پرستانہ شرکت کی داستانیں بیان کرتی ہیں بلکہ خواتین مجاہدین آزادی کی خونچکاں تفصیلات سے قاری کو ملول بھی کرتی ہیں اور عصر حاضر کی خواتین کے لیے نمونہ بن کر ان میں عزم و حوصلہ بھی جگاتی ہیں۔ جنگ آزادی میں خواتین نے کیا کیا رول ادا کیے؟ اور کس کس طرح سے قربانیاں دیں وطن میں خواتین کی قربانیوں سے متعلق تاریخی واقعات سن کر، پڑھ کر دل دہل جاتے ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جن سے ہندوستان کی نئی نسلیں شاید ہی واقف ہوں گی۔ خصوصاً خواتین ان حقائق سے کس قدر واقف ہونگی اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جنگ آزادی کے سورماؤں اور خاص طور سے خواتین کی قربانیوں سے ہر ہندوستانی کو واقف ہونے کی ضرورت ہے تاکہ رفتہ رفتہ حب الوطنی کے ختم ہوتے جذبے کی بازیافت ہوسکے اور ان جذبات کو دوبارہ استحکام مل سکے۔

سب سے پہلے میں رانی لکشمی بائی کا تذکرہ کرنا چاہوں گی۔ جنہیں 1857ء کی ہیروئین کہا جاتا ہے۔ لکشمی بائی نے جان دے دی لیکن سلطنت برطانیہ کے آگے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ اپنی آخری سانس تک انگریزوں سے مقابلہ کرتی رہیں۔ لکشمی بائی جب سورن ریکھا ندی پار کررہی تھی اس وقت اس کی ران میں گولی لگ گئی۔ اس کا داہنا گال چ

گیا۔ زخموں سے چور رانی کو رگھوناتھ سنگھ، رام چندر دیشمکھ اور گل محمد نے کسی طرح بابا گنگا داس کے مٹھ پر پہنچایا جہاں بہادر رانی نے آخری سانس لی۔ "لکشمی بائی کے عزم و استقلال کو دیکھ کر خود انگریز حیران تھے۔ برٹش جنرل سر ہیو روز جس نے رانی سے مقابلہ کیا اور رانی کو شکست دی، اس نے رانی کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:

"انقلابیوں میں سب سے بہادر اور سب سے عظیم سپہ سالار تھیں رانی لکشمی بائی۔"

"مہارانی اونتی بائی" نے سات سال کی عمر میں عسکری تربیت حاصل کی ان کی مہارتوں اور قابلیتوں کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں ہوگا۔ رام گڑھ ریاست میں انگریزوں کی مداخلت اس قدر بڑھی کہ مہارانی کا حریت پسند ضمیر تلملا کر رہ گیا۔ اور یہیں سے اُنھوں نے انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے اور آخری دم تک لڑتی رہی اور لڑتے لڑتے جان دے دی۔

حیرت انگیز بات ہے کہ اس آہنی عزم و حوصلے والی خاتون میں کہاں سے حب الوطنی کا یہ جذبہ سمٹ آیا تھا کہ دیوار گڑھ کے جنگلات میں پناہ لینا اُسے منظور رہا اور ہتھیار ڈال دینے کے انگریزوں کے مطالبے کو جس نے پائے حقارت سے ٹھکرا دینے میں ذرہ برابر بھی جھجک محسوس نہیں کی جب کہ اس کی زندگی خطرات کے گھیرے میں تھی اور ہوا بھی یہی کہ وہ گھیر لی گئی اور چھاپہ مار جنگ میں اس نے نزدیک موجود امراؤ سنگھ سے تلوار لے کر اپنی چھاتی میں گھونپ لینا گوارہ کیا بجائے اس کے کہ وہ گرفتار ہوتی یا ماردی جاتی۔

"بیگم حضرت محل" نے جنگ آزادی میں اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔ بیگم حضرت محل ریاست اودھ پر ہونے والی انگریزی ریشہ دوانیوں کے خلاف کھڑی ہوگئی تھیں۔ کان پور کے نانا صاحب اور آگرہ کے مولوی احمد اللہ شاہ کی درخواست رہنمائی کو منظور کرنے والی ایک اکیلی خاتون تھیں جب کہ دیگر بیگمات نے اس درخواست پر توجہ نہیں دی تھی۔ انقلابیوں کو ایک کامیاب قیادت فراہم کرنے کو جو لوگ آگے آئے، ان میں بیگم حضرت محل کا نام نمایاں ہے۔ اگر نیپال کے مہاراجہ انگریزوں کی مدد کو نہ

آتے تو شاید لکھنؤ پر انگریزوں کے قبضے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا۔ جب انگریزوں کا لکھنؤ پر قبضہ ہوا تو بیگم حضرت محل نیپال چلی گئیں اور وہاں بھی انگریزوں سے مقابلہ جاری رکھا۔ گویا ایک مسلسل جنگ کی حالت میں رہیں اور آخری دم تک انگریزوں سے برسرِ پیکار رہیں۔ اُنھیں طرح طرح کی لالچ دی گئی کہ وہ سر جھکادیں، لیکن اُنھوں نے اسے منظور نہیں کیا اور ایک سادہ زندگی کو ترجیح دی۔

ایک اور مجاہدۂ آزادی "مینا" کا ذکر بھی ہے۔ "مینا" نانا صاحب پیشوا کی بیٹی تھی۔ مینا پر جو کچھ گزری وہ نہایت ہی دلدوز داستان ہے۔ جس وقت مینا کی پناہ گاہ پر انگریزوں کی جانب سے گولے برسائے جارہے تھے۔ اور جب اس کی پیشی جنرل "آوٹ رم" کے سامنے ہوئی تو بڑی جرأت سے اُس نے اپنے والد کے رازوں کو آشکارہ کرنے سے انکار کر دیا۔ جنرل آگ بگولہ ہوگیا اور اسے نذرِ آتش کردیا۔ لیکن جنرل اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ اُس کی چتا سے اُٹھنے والے شعلے انگریزی سلطنت کی بربادی

کا پیغام دیں گے اور جسے وہ نذر آتش کرکے ختم کرنے کا گمان بے جا کر رہا تھا، وہ تاریخ آزادی ہند میں ہمیشہ کے لیے زندہ و تابندہ ہو جائے گی۔

آزادی کی مجاہدہ "عزیزن بائی" کی داستان خونچکاں بھی دل دہلا دینے والی ہے۔ وہ دراصل ایک پابند صوم وصلوٰۃ خاتون تھی، متقی اور پرہیز گار تھی لیکن اپنی زندگی کے نشیب و فراز کے درمیان ایک ایسا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ اس زمانے میں جسے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا یعنی رقص و سرور کی محفلیں سجانا۔ عزیزن بائی کی حب الوطنی اور ان کی قربانیوں کے تذکرے میں اس دور کی ہندوستانی نسلوں کے لیے ایک ایسا درس ہے جو ان کی سوچ کو بدل سکتا ہے اور ان کی زندگیوں کے ڈھب کو تبدیل کرکے ملک کی خدمت پر آمادہ کر سکتا ہے لیکن ان جانباز خواتین کی زندگیوں کے بارے میں مطلع کرنے والا کون ہے اور کون ہے جو اپنے آبا کی ان کوششوں سے متعارف کرائے۔ اسے جو سزا دی گئی، یقین نہیں ہوتا کہ اتنی سخت سزا کا آج کا ہندوستانی تصور بھی کر سکتا ہو۔ عزیزن بائی کو ایک ستون سے باندھ کر چاروں طرف آگ جلا دی گئی اور پھر اسے گولیوں سے بھون دیا گیا۔

رانی چنما کنور، جو آج کرناٹک کا ایک حصہ ہے، انگریزوں کے زمانے میں ریاست تھی اس ریاست کی بے پناہ دولت پر انگریزوں کی نظر

تھی۔ کنور پر قبضہ کرکے انہوں نے مظالم کی انتہا کر دی۔ رانی چنما نے باقاعدہ جنگ کا اعلان کیا۔ آج بھی کرناٹک میں رانی چنما کی بہادری کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔"

اصغری بیگم ایک مقررہ تھیں اور اپنی تقریروں سے لوگوں میں آزادی کا جوش بھر دیا کرتی تھیں۔ ان کی شعلہ بیانی سے پیدا شدہ بے چینی کے پیش نظر انگریزوں نے انہیں گرفتار کیا اور انہیں بھی زندہ جلا دیا گیا۔ سلطان زمانی بیگم نے بھی جنگ آزادی میں حصہ لیا، اپنے شوہر کے ساتھ شانہ بہ شانہ آزادی کی جنگ لڑیں اور بالآخر مکہ پہنچ گئیں اور وہیں انتقال فرما گئیں۔

مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی والدہ ماجدہ جو بی اماں کے نام سے مشہور تھیں، وہ بھی آزادی کے لیے اپنے وطن پر مرمٹنے کا جذبہ رکھتی تھیں۔ گاندھی جی بی اماں کو "اتحاد اور آزادی' وطن کا نشان" کہتے تھے۔ اسی طرح ویدکماری، آگیاوتی اور میمو بائی کے نام بھی اس میں شامل ہیں۔ جنہوں نے جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ سعادت بانو کچلو امرتسر سے تھیں اور آزادی کی تحریک سے وابستگی کے بعد انہوں نے تاعمر کھدر کا لباس پہنا۔ ان کی یہ رباعی آج بھی مشہور ہے:

نہ ہارو ہمتیں اپنی، نہ تم ملول رہو
شگفتہ گلشن ہستی میں بن کے پھول رہو
یہ التجا ہے سعادت کی بھول مت جانا
ہو جس طرح سے بھی تم لے کے ہوم رول رہو

"ماتنگنی ہاجرہ" نے جدوجہد آزادی میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جنھیں پڑھ کر حیرت سے آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں۔ کولکاتا میں پہلی

مرتبہ جس خاتون کا مجسمہ نصب کیا گیا وہ "ماتنگنی ہاجرہ" کا مجسمہ ہے۔ ناگپور کی رہنے والی خاتون کلثوم بی نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 'مولانا محمد علی جوہر' کی رفیقہ' حیات "امجدی بیگم" کی بہادری اور حب الوطنی کا بھی ذکر بیجا نہیں ہے۔ 'گاندھی جی' امجدی بیگم کو بہادر خاتون کہا کرتے تھے۔ ہندوستانی زبان میں جب وہ عوام سے خطاب فرماتیں تو عوام پر اس کا بہت اثر ہوتا۔ جنگ آزادی کے متوالوں میں ایک اور نام "سلطانہ حیات انصاری" کا بھی ملتا ہے انھوں نے نہ صرف اپنے وطن کی خدمت کی بلکہ اپنی تقریروں سے لوگوں کے دلوں میں حب الوطنی کے جذبہ کو ابھارا اور ساتھ ہی ساتھ اردو کے فروغ میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ "کلثوم سایانی" نے مسلمانوں کو تعلیم کے میدان میں آگے بڑھانے کے لیے بہت کوششیں کیں اور اس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوئیں۔

رانی درگاوتی، صوبہ دار آصف خاں کے حملے کی خبر سن کر رانی درگاوتی نے جنگ کا اعلان کر دیا۔ دشمنوں نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا

۔ایک تیر ان کی آنکھوں میں لگا جسے رانی نے نکال پھینکا اور مسلسل لڑتی رہیں پھر ایک تیر ان کے گلے کے آر پار ہو گیا بری طرح زخمی ہونے کے باوجود بھی دشمنوں کے آگے سر کو جھکنے نہ دیا۔

چاند بی بی ایک عورت تھیں لیکن بہادری اور وطن سے محبت میں وہ مردوں سے کہیں آگے تھیں شاہی خاندان میں پیدا ہونے کے باوجود وطن پر مر مٹنے کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

اہلیا بائی جہاں میدان جنگ میں ایک بہادر سپہ سالار تھیں وہیں رعایا کی بھلائی کے کاموں میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھیں۔ ہمارے باپو گاندھی جی کی دھرم پتنی کستور با گاندھی کے سچے دیش بھگت ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کی موت جیل میں ہوئی۔

سروجنی نائیڈو، نے زندگی بھر دیش کی سیوا کی اور اس کے ساتھ ساتھ عورتوں کی ترقی کے بہت سے کام کیئے۔ دنیا میں بہت کم عورتیں ایسی ہوں گی جنھوں نے اپنے دیش کے لئے سروجنی نائیڈو جیسی قربانیں دی ہوں گی۔

وجے لکشمی پنڈت کی دیش سیوا اور ان کی بے شمار قربانیوں کی وجہ سے آج ساری دنیا ان کی تعریف کرتی ہے اگر ہمارے دیش کی عورتیں وجے لکشمی پنڈت کی زندگی سے ذرا سا بھی سبق لیں تو ہمارا دیش ایسی ترقی کرے گا کہ دنیا حیران رہ جائے گی۔

سکینہ لقمانی بدر الدین طیب جی کی بیٹی تھیں۔ ایک باہمت مجاہدۂ آزادی تھی۔ گاندھی جی کے قتل کے بعد جو جلوس ممبئی میں نکلا اس کی قیادت انہوں نے کی تھی۔ لاڈو رانی زتشی لاہور سے تھیں۔ آزادی کی جد جہد میں سخت تکلیفیں اٹھائیں۔ خواتین میں آزادی کا جوش بھرا اور انہیں جنگ آزادی میں شریک کروایا۔ سرلا دیوی چودھری نے وندے ماترم کا نعرہ لگا کر میدان میں اتریں اور اپنا حصہ ادا کیا۔ ''استری مہا منڈل'' کے پلیٹ فارم سے خواتین کو آزادی کی لڑائی لڑنے کے لیے تیار کیا۔ نشاط النساء بیگم موہانی ضلع اُناؤ سے تھیں۔ یہ حسرت موہانی کی اہلیہ تھیں اور اپنے شوہر کی گرفتاری کے بعد بڑی پامردی کا مظاہرہ کیا اور جنگ آزادی میں اپنا رول نبھایا۔ راہِ جدوجہدِ آزادی میں ڈٹی رہیں۔ مولانا آزاد بھی ان سے متاثر رہے اور مولانا حسرت موہانی کی اصل طاقت کہا۔ کملا نہرو، جواہر لال نہرو کی شریک حیات تھیں جنھوں نے اپنی طاقت کے مطابق جنگ آزادی میں اپنا نام درج کروایا۔ پربھات پھیری نکالی۔ شراب کی دکانوں کو بند کروانے کی مہم چلائی۔ زخمی مجاہدین کی تیمارداری کی۔ غرض کہ پنڈت نہرو کی سرگرم ساتھی بنی رہیں۔ زلیخا بیگم، سھدرا کماری چوہان، وینا داس، من موہنی سہگل، امجدی بیگم، جمنا دیوی، شانتی سدھا گھوش اور سنیتی چودھری، بی بی امت السلام، ریحانہ طیب جی، پریتی لتا پوڑار، کلپنا جوشی، ستیہ وتی، آمنہ قریشی، بیگم خورشید خواجہ، اتری دیوی، کنک لتا بُروا، سھدرا جوشی، خدیجہ بیگم، حمیدہ طیب جی، امیت دیوی، میری کیمپ بیل، سہاسنی گانگولی، سلطانہ حیات انصاری، صغریٰ خاتون، امینہ طیب جی، درگا بھابی، زبیدہ بیگم، فاطمہ اسمٰعیل، سشیلا دیوی، میڈم بھیکا جی کاما، نور النساء عنایت خان، اینی بیسنٹ، ارونا آصف علی، سچیتا کرپلانی، راجکماری امرت کور، لکشمی سہگل، سشیلا نائر، مان وتی آریہ کی جدوجہد آزادی کی تفصیلات کے ساتھ سارے بھارت ورش کو آزادی کی خاطر اپنی جانیں نچھاور کرنے والی خواتین کی داستان سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ جس آزاد ہندوستان میں ہم آج چین کی سانس لے رہے ہیں اُس کی بنیاد میں مرد تو مرد خواتین تک نے کس طرح اپنا سکھ چین ملک کی آزادی پر نچھاور کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض کو زندہ جلا دیا گیا یا قتل کر دیا گیا۔

یہ وہ عظیم ہستیاں ہیں جنھوں نے ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزادی دلانے کے لیے اپنی جان تک کی بازی لگا دی۔ محبِ وطن کی ذمہ داری نبھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ چھوڑا۔ کئی بار جیل گئیں۔ جیل کی اذیتوں کو سہا مگر زبان سے اف نہ کیا اور ہنستے ہنستے پھانسی کے پھندے کو گلے سے لگا لیا۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں گاندھی جی کے ساتھ مل کر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک وہ جنگ آزادی سے جڑی رہیں۔ انگریز افسر ہڈسن کا کہنا تھا:

''جس ملک کی عورتیں اتنی جانباز اور وفادار ہیں۔ وہاں انگریزوں کی حکومت صرف چند غداروں کی نمک حرامی پر منحصر ہے۔''

تاریخ کے سینے پہ لکھی ہے یہ حقیقت
عورت بھی بدل سکتی ہے اک قوم کی قسمت

نصرت جہاں

اکیسویں صدی کی خواتین کو درپیش مسائل

اکیسویں صدی کی خواتین کے سامنے بہت ساری مشکلات اور چیلنجز ہیں۔ تمام تر ترقیوں سے ہمکنار ہونے اور بلندیوں پر پہنچنے کے باوجود بھی آج خود ساختہ مہذب سماج میں رحم مادر میں ہی بچیوں کو قتل کرنے کا گھناؤنا کھیل جاری ہے۔ آزادی نسواں کے علمبرداران کے دعوؤں کے برعکس خواتین کو ناانصافی اور عدم مساوات کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ چاہے سیاسی نمائندگی کا مسئلہ ہو یا سماجی برابری کا معاملہ ہر میدان میں عورتیں نہ صرف پیچھے ہیں بلکہ آج کوئی بھی منظم اور پرخلوص کوشش ان کو برابری کے حقوق دلانے کے لیے کارگر دکھائی نہیں پڑتی ہے۔

خواتین کے چند اہم مسائل:

تعلیمی مسائل: آج بھی ہمارے معاشرے میں یہ غلط تصور پایا جاتا ہے کہ عورت اگر تعلیم یافتہ ہوجائے گی تو وہ رسم ورواج اور عادات واطوار کا پاس ولحاظ نہ کرے گی اور بچوں کی تربیت اور گھر کے امور کی ذمہ داری سے دستبردار ہوجائے گی۔ جب کہ حقیقت اس کے برخلاف ہے کیونکہ ایک تعلیم یافتہ، مہذب اور باشعور خاتون ایک صالح اور بہتر معاشرہ کی تشکیل میں بہترین رول ادا کرسکتی ہے۔

سماجی برابری کے مسائل: اگرچہ اقوام متحدہ کا 1945 کا منشور عورتوں اور مردوں کو یکساں حقوق فراہم کرتا ہے اور اسی طرح سے اقوام متحدہ کا 1948 کا اعلان برائے انسانی حقوق، عورتوں اور مردوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتا ہے مگر آج بھی خواتین کو برابری کے حقوق حاصل نہیں ہیں۔ بیڈمنٹن کی مشہور کھلاڑی سائنا نہوال کی جب پیدائش ہوئی تو ایک ماہ تک ان کی دادی ان کو دیکھنے صرف اس لیے نہیں گئیں کہ ان کو پوتی کی نہیں بلکہ ایک پوتے کی ضرورت تھی۔

صحت کے مسائل: ہمارے معاشرے میں صحت ایک اہم مسئلہ ہے اور اس سے مرد اور عورت دونوں دوچار ہیں۔ مگر عورتوں کو اس سلسلے میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اگر گھر کا کوئی فرد بیمار ہوجائے چاہے وہ بچہ ہو یا بوڑھا تو اس کی تیمارداری کا فریضہ خواتین کو ہی انجام دینا ہوتا ہے۔ مگر جب ایک عورت بیمار ہوجائے خاص طور پر دیہی علاقوں میں تو اس کو علاج کے لیے نہ تو کوئی تیماردار نصیب ہوتا ہے اور نہ علاج کے لیے کسی بہتر ڈاکٹر تک رسائی ہی ہو پاتی ہے۔

اقتصادی مسائل: خواتین جو ہمارے سماج اور معاشرے کی تقریباً نصف آبادی پر مشتمل ہیں ان کو اقتصادی طور پر کامیاب بنانے اور اقتصادی معاملات میں ان کو برابر کا شریک کار بنانے کے سلسلے میں مخلصانہ کوششوں کا فقدان ہے۔ نہ صرف ملازمت بلکہ تمام شعبہ ہائے زندگی میں خواتین عدم مساوات کا شکار ہیں اور ان کی مناسب نمائندگی نہیں ہے۔ ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ آج ملازمت کرنے والی عورتوں کو مختلف قسم کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہتر ہوتا کہ حکومتیں ان پریشانیوں کا حل پیش کریں اور ان مشکلات کو ختم کریں تاکہ خواتین کی حوصلہ افزائی ہو اور زیادہ سے زیادہ خواتین ملازمت کی طرف راغب ہوں مگر حکومتوں کی عدم دلچسپی کی وجہ سے ملازمت کرنے والی خواتین کے مسائل میں کمی آنے کے بجائے روز بروز اضافہ ہی ہو رہا ہے۔

سیاسی نمائندگی کے مسائل: آج ہمارے معاشرے میں عورت کو سیاست میں برابر تصور نہیں کیا جاتا ہے اور ان کو مساوی تسلیم نہیں کیا جاتا ہے حالانکہ یہ بات قابل غور ہے کہ گھر کے انتظامی امور میں ہم اسی عورت پر بھروسہ کرتے ہیں اور بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ عورت گھریلو امور کے انتظام و انصرام کو بخوبی نبھاتی ہے تو پھر ہم صوبائی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر اس پر بھروسہ کیوں نہیں کرتے ہیں۔ یہ کسی حد تک ہمارے سماج اور معاشرے کے دوہرے کردار کو ظاہر کرتا ہے۔

امکانات

بلاشبہ عورتوں کو جب بھی مواقع فراہم ہوئے ہیں انہوں نے ان کا بھرپور استعمال کیا ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں مردوں کی برابری کرنے کی اہل ہیں۔

خواتین اور تعلیم: جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ ''اگر آپ ایک مرد کو تعلیم دیتے ہیں تو آپ ایک فرد کو تعلیم دیتے ہیں، لیکن، جب آپ ایک عورت کو تعلیم دیتے ہیں تو پورے خاندان کو تعلیم دیتے ہیں۔ خواتین کو بااختیار بنانے کا مطلب مادر ہند کو بااختیار بنانا ہے۔''

ہندوستان میں 1951 کے اعداد و شمار کے مطابق عورتوں کی شرح خواندگی 8.86 فیصد تھی اور مردوں کی 27.16 فیصد تھی۔ 2011 کے اعداد و شمار کے مطابق خواتین کی شرح خواندگی 65.46 ہے جبکہ مردوں کی شرح خواندگی 82.14 ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اب لوگ بچیوں کو تعلیم دینے لگے ہیں اور بلاشبہ عورتوں نے تعلیمی میدان میں اپنی موجودگی کا احساس دلوایا ہے۔ اس سلسلے میں کلپنا چاولہ کا نام لینا ہی کافی ہے۔

سماجی مسائل میں برابری: عورت نے برابری حاصل کرنے کی سمت میں کافی حد تک پیش رفت کی ہے۔ اس سلسلے میں حکومت ہند نے مختلف قوانین وضع کیے ہیں اور سماجی تنظیموں اور شخصیات نے بھی کافی محنت کی ہے۔ اگر ماضی سے مقابلہ کیا جائے تو یقیناً خواتین کو زیادہ حقوق حاصل ہوئے ہیں۔ مگر آج بھی خواتین کو مختلف میدانوں میں عدم مساوات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور سماج میں اس کو برابری کے حقوق حاصل نہیں ہیں۔

صحت کے مسائل: بلاشبہ صحت مند خواتین ایک صحت مند معاشرے کی ضامن ہیں۔ حکومت ہند، غیر سرکاری تنظیمیں اور ادارے عورتوں کی صحت سے متعلق مختلف اسکیموں اور پروگراموں کو نافذ کرتی ہیں اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ خواتین کو بہترین خدمات فراہم کریں۔ اس میدان میں مزید کوششوں کی ضرورت ہے مثلاً خواتین ڈاکٹروں کی عدم دستیابی کی وجہ سے بہت ساری خواتین علاج نہیں کرا پاتی ہیں لہٰذا اس سمت میں کوشش کی جانی چاہیے اور خواتین ڈاکٹروں کی حصولیابی ممکن بنانی چاہئے۔

اقتصادی مسائل: پیپسی کی چیف ایگزیکیٹو آفیسر اندرا نووی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عورت اقتصادی میدان میں بھی مردوں سے کسی بھی صورت میں پیچھے نہیں ہے۔ اسی طرح سے عورتوں نے خود امدادی گروپ کی تشکیل اور منظم اور کامیاب طور پر اس کو چلا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر عورتوں کو اقتصادی امور میں برابری کی شراکت حاصل ہو تو وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر بہتر خدمات انجام دیں گی۔

سیاسی نمائندگی: پنچایتوں اور دوسری مقامی اکائیوں میں ریزرویشن کی وجہ سے عورتوں کی نمائندگی میں اضافہ ہو رہا ہے اور عورت صدر جمہوریہ، وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ سمیت دیگر اہم مناصب پر فائز ہو چکی ہے۔ مگر ابھی بھی پارلیامنٹ اور قومی اسمبلیوں میں ان کا تناسب ان کی آبادی کے لحاظ سے کافی کم ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

بلاشبہ اکیسویں صدی خواتین کی صدی ہو سکتی ہے بشرطیکہ خواتین اپنے مسائل، مشکلات اور حقوق کے تئیں بیداری کا ثبوت دیں اور سماج اور معاشرے میں برابری حاصل کرنے کے لیے وہ مسلسل جدوجہد سے کام لیں اور اس وقت تک آرام سے نہ بیٹھیں جب تک ان کو سماج میں وہ تمام حقوق حاصل نہ ہو جائیں جن کی وہ بجا طور پر حقدار ہیں۔ اس سلسلہ میں مردوں کو بھی رواداری اور فراخ دلی کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور صدیوں سے قائم غیر عادلانہ نظام کے خلاف ان کو بھی آواز بلند کرنی چاہیے۔

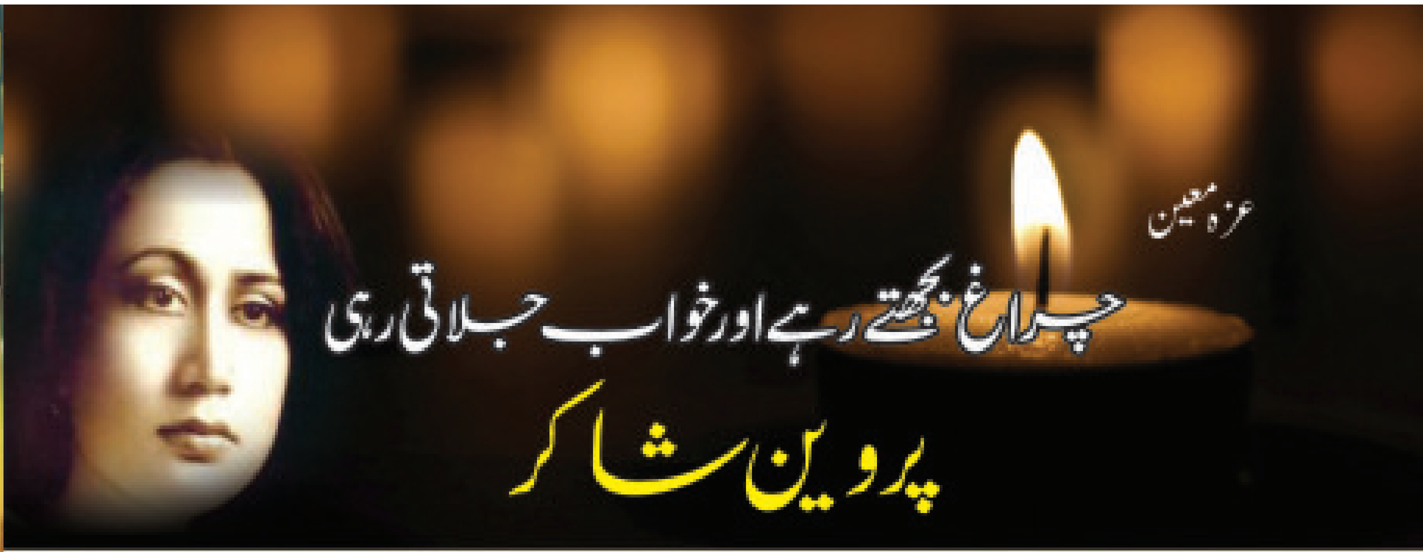

عزہ معین

چراغ بجھتے رہے اور خواب جلاتی رہی

پروین شاکر

ادب کی پرکھ رکھنے والے عظیم شعراء و مصنفین نے ثابت کیا ہے کہ شاعر تلامیذ الرحمن ہوتا ہے۔ شاعری خداداد صلاحیت ہوتی ہے۔ ذات کا عرفان حاصل ہونے پر ہی شاعر کو عروج وزوال، واقعات و حادثات اور سسکتی جوانیوں کی عکاسی کرنے کا فن آتا ہے۔ معاشرے کی زندگی کا فلسفیانہ مطالعہ اور ذات سے وابستگی کی تعبیر و تفہیم ادب کا خاص پہلو ہے جس کا بیان شاعری اور دیگر تخلیق میں قلم کے ذریعے کیا جاتا ہی ادب کہلاتا ہے۔ قلم کار کا گہرا شعور اور احساس اسے سماج میں ہو رہے واقعات کی طرف عام افراد سے زیادہ متوجہ کرتا ہے اور ایک ذمہ دار شاعر اپنا فرض ادا کرتے ہوئے روایت کی پاسداری اور سوئے ہوئے اذہان کو جگانے کا کام کرتا ہے۔ شاعر کی نوک قلم سے وہی کچھ بیان ہوتا ہے جس کا اس کی زندگی پر اثر پڑا ہو۔ پھر چاہے وہ واقعات اس سے وابستہ نہ ہوں لیکن کسی نہ کسی طور سے اس پر یا اس کے ذہن پر اثر ضرور ڈالتے ہیں۔ شاعر واقعات کی مکمل رپورٹ بڑے پر اثر انداز میں قاری کے گوش گزار کر دیتا ہے۔

پاکستان کی معروف شاعرہ اور عالمی ادب کی ممتاز خاتون پروین شاکر نے نہ صرف شعروشاعری کو اپنایا بلکہ اس میں عورت کی انا وخودداری، جذبات واحساسات، بے بسی، شرم وجھجک اور روایات سے ہونے والے خسارے الغرض سبھی کچھ دنیا کے سامنے رکھ دیا۔ ان کے اشعار میں زخم ملتے ہیں۔ جھلستے مکان ملتے ہیں۔

وہ ہوا تھی کہ کچے مکانوں کی چھت اڑ گئی اور کہیں لاپتہ ہو گئے
اب تو موسم کے ہاتھوں (خزاں میں) اجڑنے کو بس خواب کی بستیاں رہ گئیں
اجنبی شہر کی اولیں شام ڈھلنے لگی، پرسہ دینے جو آئے۔ گئے
جلتے خیموں کی بجھتی ہوئی راکھ پر بال کھولے ہوئے بیبیاں رہ گئیں

پروین شاکر 1952ء میں کراچی میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد کا نام ثاقب حسین تھا شاعری کا ذوق تھا اور شاکر تخلص رکھتے تھے۔ پروین کی تربیت بچپن سے ہی صحت مند خطوط پر ہوئی۔ تعلیمی سرگرمیاں ہمیشہ سے ہی اعلیٰ پیمانے کی رہیں۔ انگلش لٹریچر اور لنگوئسٹکس میں ماسٹرز کرنے کے بعد انھوں نے پہلے تاریخ اور پھر انگلش لیکچرر کے عہدے پر خدمات انجام دیں۔ سی ایس ایس کا امتحان پاس کرنے کے بعد کسٹم اسسٹنٹ کے عہدے پر فائز ہو گئیں۔ ترقی کی منازل طے کرنے کے ساتھ ایک دکھ ان کے لہلہاتے چمن پر بجلی بن کر گرا وہ تھا ان کے شوہر کا طلاق کی حد تک نفرت کرنا۔ پروین شاعرہ تو تھیں ہی لیکن اس شعر کو انھوں نے تضمین کے طور پر اپنی زبان میں استعمال کیا تھا۔

طلاق دے تو رہے ہو عتاب وقہر کے ساتھ
مرا شباب بھی لوٹا دو میری مہر کے ساتھ
میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

پروین شاکر نے ہمیشہ اپنی شاعری کو خالص رکھا۔ وہ وہی کہتی تھیں جو محسوس کرتی تھیں۔ پروین شاکر نے اپنی طلاق کے بعد بہت درد بھری شاعری کی ہے۔ ان کی زندگی میں ڈھیروں کامیابیوں کے ساتھ ان کے شوہر کا مزاج ان سے نہ ملنا ایک بڑا المیہ تھا۔ ان کا ہم سفر اپنے وعدوں پر قائم نہ رہا اور جلد ہی ان کے درمیان سرد جنگ کا آغاز ہو گیا۔ دونوں کے مزاج زیادہ عرصہ ایک دوسرے کو برداشت نہ کر سکے۔ پروین شاکر کی کوششوں کے باوجود ان کا رشتہ رک نہیں پایا۔ ان سارے واقعات کو پروین نے اپنی شاعری کے سپرد کر دیا اور ایسے نایاب اشعار وجود میں آئے جو اردو ادب کے بے مثال نمونہ کلام قرار پائے۔

تجھے مناؤں کہ اپنی انا کی بات سنوں
الجھ رہا ہے میرے فیصلوں کا ریشم پھر
نہ اس کی بات میں سمجھوں نہ وہ مری نظریں
معاملات زباں ہو چلے ہیں مبہم پھر
زندگی تجھ سے دور رہ کر میں
کاٹ لوں گی جلا وطن کی طرح

پروین کی شاعری میں سب سے زیادہ ضمیر متکلم (صنف نازک) کا

استعمال ملتا ہے۔ جو ان کے علاوہ خال خال ہی کسی شاعرہ کے کلام میں نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعے کے بعد ان کی حق گوئی، بلوریں کھرا پن، اور سچے جذبات و تجربات کا تجزیہ کرنے کا ہنر متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔

میرا نوحہ کناں کوئی نہیں ہے
سو اپنے سوگ میں خود بال کھولوں
وہ اب میری ضرورت بن گیا ہے
کہاں ممکن رہا اس سے نہ بولوں
میں اپنے آپ کو ڈسنے لگی ہوں
مجھے اب زہر اچھا لگ رہا ہے
پذیرائی کو میری شہر گل میں
صبا کے ہاتھ میں پتھر رہا ہے
ایک مشت خاک اور وہ بھی ہوا کی زد میں
ندگی کی بے بسی کا استعارہ دیکھنا
ہم تو سمجھے تھے کہ ایک زخم ہے بھر جائے گا
کیا خبر تھی کہ رگ جاں میں اتر جائے گا

بیسویں صدی کے آخری چوتھائی حصہ اور اکیسویں صدی کے آغاز میں پروین شاکر نے دنیائے ادب میں ایک ہلچل پیدا کردی۔ ان کی پر کشش شخصیت اور منفرد انداز بیان ان کی شاعری کو عروج کی لازوال منزلوں سے ہم کنار کر گیا۔ شاعری میں جذبات کی عکاسی کا ایسا نادر نمونہ اور کسی خاتون کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔ شاعر اپنے اسلوب و لہجے کی بنا پر جانا جاتا ہے۔ ان کے الفاظ اور موضوعات ہی انھیں زندہ رکھتے ہیں۔

مر بھی جاؤں تو کہاں، لوگ بھلا ہی دیں گے
لفظ میرے، مرے ہونے کی گواہی دیں گے

پروین شاکر کی شاعری اسی پس منظر میں تخلیق کی گئی ہے۔ یہ نہ صرف عاشقانہ موضوعات کو اپنے اندر سمو لیتی ہے بلکہ معاشرتی منظر نامے پر چل رہے واقعات اور ملک و قوم کی چیخوں کو سوئے ہوئے کانوں تک پہنچانے کا کام کرتی ہے۔

جن کے کھیت اور آنگن ایک ساتھ اجڑے ہیں
کیسے حوصلے ہوں گے ان غریب ماؤں کے

پروین شاکر کی شاعری میں احساس اور وقوف احساس بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔ ان کی غزلوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی غزل جذبات کی وضاحت و صداقت کے ساتھ ساتھ عرفان ذات کی بھی آئینہ دار ہے۔

مجھے بارش کی چاہت نے ڈبویا
میں پختہ شہر کا کچا مکاں ہوں
خوشبوئیں مجھ کو قلم کرتی گئیں
شاخ در شاخ مرے ہاتھ کٹے
سکون دل کے لیے میں کہاں کہاں نہ گئی
مگر یہ دل کہ سدا اس کی انجمن میں رہا
چراغ بجھتے رہے اور خواب جلتے رہے
عجیب طرز کا موسم مرے وطن میں رہا
اہرام ہے یا کہ شہر میرا
انسان ہیں یا حنوط لاشیں

پروین شاکر نے ادبی روایات سے رشتہ بنائے رکھا اور غزل میں کلاسیکی قدروں کی آمیزش سے ایک نیا آہنگ و سانچہ تیار کیا۔ ان کی شاعری میں حسن و صداقت بولتی نظر آتی ہے۔ اپنی آپ بیتی کو شعر کے لہجے میں پرو کر بیان کر دینے کا فن کسی کسی کے ہی قلم سے ممکن ہوتا ہے۔ ایک جگہ زندگی کے ہمہ جہت تحرک میں اپنے احساس کو پیش کرتی ہیں:

جس طرح خواب میرے ہو گئے ریزہ ریزہ
اس طرح سے نہ کبھی ٹوٹ کے بکھرے کوئی
اس سے ایک بار تو روٹھوں میں اسی کی مانند
اور مری طرح سے وہ مجھ کو منانے آئے
میں اس کی دسترس میں ہوں مگر وہ
مجھے میری رضا سے مانگتا ہے
ہمیں خبر ہے کہ ہوا کا مزاج رکھتے ہو
مگر یہ کیا کہ زرا دیر کو رکے بھی نہیں
خوش نہ تھا مجھ سے بچھڑ کر وہ بھی
اس کے چہرے پہ لکھا تھا لوگو
یاد کر کے مجھے نم ہو گئی ہوں گی پلکیں
آنکھ میں پڑ گیا کچھ کہہ کے یہ ٹالا ہوگا

نسائی انا کی سلامتی کی بے حد حسین تصاویر پروین کی شاعری میں ملتی ہیں۔ عورت کو ہمیشہ ہی دبایا جاتا کچلا جاتا پروین کے دل کو چھو کے لگا تا ہے وہ اپنی خودداری سے اس کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان کی شاعری میں خواتین کے لئے نصیحت بھی ہے اور کشش بھی:

میں کیوں اس کو فون کروں
اس کے بھی تو علم میں ہوگا

کل شب
موسم کی پہلی بارش تھی
بچھڑتے وقت دلوں کو اگرچہ دکھ تو ہوا
کھلی فضا میں مگر سانس لینا اچھا لگا
ذکر آئے گا جہاں بھوروں کا
بات ہوگی مرے ہرجائی کی
کنار صحن چمن سبز بیل کے نیچے
وہ روز صبح کا ملنا تو اک فسانہ ہوا
میں سوچتی ہوں کہ مجھ میں کمی تھی کس شے کی
کہ سب کا ہو کے رہا وہ، بس اک مرا نہ ہوا
اجنبی بن کے جو گزرا ہے ابھی
تھا کسی وقت وہ اپنا لوگو

پروین شاکر معاشرتی جھوٹی اقدار کی پاسداریوں اور سماجی ناسوروں پر گہرا طنز کرتی ہیں۔ ایسی الجھنوں کو جن کو بیان کرنے کی وجہ سے صرف لڑکیوں کے کردار پر انگلیاں اٹھائی جاتی ہیں۔ صنف نازک ہونے کی بنا پر ان کو ہی قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے۔ یہ فرسودہ روایات یہ سماج جس جگہ بچیاں اپنی بے جا شرم، ادب و آداب کی وجہ سے مشکلات کا شکار ہو جاتی ہیں انھیں ان کی طرف بھی اعتراض کرنے کی چاہت رہتی ہے۔ پروین شاکر کی نظر سبھی طبقات کے رموز سے پردہ اٹھاتی ہے۔ انھیں نئی نسل کا اقدار عالیہ سے منحرف ہونا ان میں روایتوں کا فقدان فکر مند کرتا ہے۔ نوجوان نسل کی بے راہ روی کا بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں:

اس نسل کا فقط ذہن کٹ رہا ہے
اگلوں نے کتائے تھے فقط سر
ایسی خالی نسل کے خواب ہی کیا ہوں گے
جس کی نیند کا سرچشمہ تک چرس میں ہے

آج ایشیائی ممالک جس دور سے گزر رہے ہیں بالخصوص مسلم معاشروں کی زبوں حالی شاعری میں اپنی جگہ بنا رہی ہے ان حالات میں ماضی اور مستقبل پر بھی نظر کرنے کی ضرورت ہے۔ پروین شاکر نے بڑی صداقت کے ساتھ حالات حاضرہ سے پردہ اٹھایا ہے۔

کائی کی طرح لاشیں چٹانوں پہ اگ گئیں
زرخیزیوں سے اپنی پریشان تھی زمیں

دراصل پروین کی شاعری میں طرز احساس اور طرز اظہار میں ایک نئی جدت ہے۔ وہ آسان الفاظ میں اپنی بات کہنے کا خوبصورت انداز جانتی ہیں۔

شہر گل میں ہواؤں نے چاروں طرف اس قدر ریشمی جال پھیلا دیے
تھرتھراتے پروں میں شکستہ اڑانیں سمیٹے ہوئے تتلیاں رہ گئیں

وہ مسائل جن کی وجہ سے عہد حاضر کا انسان گھٹ گھٹ کر جی رہا ہے وہ اپنی شاعری میں نئے اسالیب کے ساتھ بیان کر دیتی ہیں۔ جنگ و انتشار کی بربادی ہوئی سسکتی زندگیوں پر نوحہ لکھنے کا پروین نے نرالا انداز اپنایا ہے۔

جب بھی غریب شہر سے کچھ گفتگو ہوئی
لہجے ہوائے شام کے نمناک ہو گئے
آنسوؤں میں کٹ کٹ کر کتنے خواب گرتے ہیں
اور اک جواں میت آ رہی ہے گاؤں میں
بادل کو کیا خبر ہے کہ بارش کی چاہ میں
کیسے بلند و بالا شجر خاک ہو گئے

پروین شاکر نے زندگی کی صرف پذیرائی ہی نہیں کی بلکہ مخالف سمت میں بھی قدم اٹھایا ہے۔ ایک جگہ اپنی وجودیت اور تمام اقدار سب ہی بغاوت کر جاتی ہیں:

چکھوں ممنوعہ ذائقے بھی
دل، سانپ سے دوستی بڑھا دے

پروین شاکر کی شاعری کے مختصر جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی غزلوں میں اپنے نازک احساسات کو اپنے شاعرانہ خلوص اور بے حد اثر انداز لہجے میں شیریں تغزل اور ہلکے ترنم میں پیش کر دینے کا ہنر جانتی ہیں۔ ان کے پڑھنے کا دلنشین انداز بھی نرالا ہے۔ ان کی شاعری اعلیٰ اسلوب اور سچے خیالات کا بہترین امتزاج ہے۔ طرز اظہار کی نیرنگی نے ان کے خیالات میں واقعیت پیدا کر دی ہے۔ انھوں نے پرانے اشاروں میں بھی نئے گوشے پیدا کر دیے ہیں جس نے ان کی غزل کو فرسودہ ہونے سے بچا لیا ہے۔ ان کی شروعاتی شاعری سے ہی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی کوشش رہی ہے کہ اس میں عوامی شناخت کے ساتھ ساتھ ان کی انفرادیت بھی قائم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام آج ان کے جانے کے طویل عرصہ بعد بھی اسی خوشبو کے ساتھ قائم و دائم ہے اور اس کے پڑھنے والے شائقین کا حلقہ روز بہ روز وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ غزل کی کیف و مستی اور لطافت کو قائم رکھتے ہوئے پروین نے اپنی زندگی کے حقائق کو عصری حقیقتوں کے صحت مند خطوط کے ساتھ غزل کے جیسے بڑے حسین لباس میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ سچ ہے کہ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

گذشتہ سے پیوستہ

تعزیرات ہند اور خواتین
جنسی و دیگر جرائم

خواجہ عبدالمنتقم

تشریح-I: جب 18 سال سے کم عمر کی کوئی عورت، کسی فاحشہ یا کسی ایسے دیگر شخص کو جو چکلا چلاتا یا چلاتی ہو یا اس کا اہتمام کرتا یا کرتی ہو، فروخت کی جائے، کرایہ پر دی جائے یا دیگر طور پر منتقل کی جائے تو اس طرح منتقل کرنے والے شخص کی نسبت، جب تک کہ اس کے برعکس کچھ ثابت نہ ہو، یہ قیاس کیا جائے گا کہ اس نے اسے اس نیت سے منتقل کیا ہے کہ وہ عصمت فروشی کی اغراض کے لیے استعمال میں لائی جائے گی۔

تشریح-II: دفعہ ہذا کے اغراض کے لیے ''ناجائز جماع'' سے ایسے اشخاص کے درمیان جنسی مباشرت مراد ہے جو کسی سلسلہ ازدواج یا ایسے کسی رشتے یا بندھن سے جڑے ہوئے نہ ہوں، جو اگرچہ ازدواج کی حد تک نہ پہنچتا ہو، تاہم اس طبقہ کے جس سے وہ تعلق رکھتے ہوں یا اگر وہ مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے ہوں تو ایسے دونوں طبقوں کے شخصی قانون یا رواج کی رو سے ان کے مابین نیم ازدواجی رشتے کو تسلیم کیا جاتا ہو۔

عصمت فروشی وغیرہ کی اغراض کے لیے نابالغ کا خریدنا

Buying minor for purposes of prostitution, etc

دفعہ 373: جو کوئی 18 سال سے کم عمر کے کسی شخص کو، اس نیت سے کہ ایسے شخص کو کسی بھی عمر میں عصمت فروشی یا کسی شخص کے ساتھ ناجائز جماع کے لیے یا کسی ناجائز اور غیر اخلاقی مقصد کے لیے کام میں لایا یا استعمال کیا جائے گا یا اس امر کے امکان کا علم ہوتے ہوئے کہ ایسا یا ایسے شخص کسی بھی عمر میں ایسی کسی غرض کے لیے کام میں لایا یا لائی یا استعمال کیا جائے گا یا کی جائے گی، خریدے، کرایہ پر دے یا دیگر طور پر اس کا قبضہ حاصل کرے، اسے دونوں میں سے کسی بھی قسم کی 10 سال تک کی سزائے قید دی جائے گی اور وہ جرمانہ کا بھی مستوجب ہوگا۔

تشریح-I: 18 سال سے کم عمر کی کسی عورت کو خریدنے والی، کرایہ پر لینے والی یا دیگر طور پر اس کا قبضہ حاصل کرنے والی کسی فاحشہ کی نسبت یا چکلا چلانے والے یا اس کا اہتمام کرنے والے کسی شخص کی نسبت جب تک کہ اس کے برعکس کچھ ثابت نہ ہو، یہ قیاس کیا جائے گا کہ ایسے شخص نے اس عورت کا قبضہ اس نیت سے حاصل کیا ہے کہ وہ عصمت فروشی کی اغراض کے لیے استعمال میں لائی جائے گی۔

ناجائز جبری مزدوری (Unlawful compulsory labour)

دفعہ 374: جو کوئی کسی شخص کو اس کی مرضی کے خلاف مزدوری کرنے پر ناجائز طور پر مجبور کرے، تو اسے دونوں میں سے کسی بھی قسم کی ایک سال تک کی سزائے قید یا سزائے جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔

زنا بالجبر (Rape)

دفعہ 375: کوئی بھی شخص جو مندرجہ ذیل سات صورتوں میں درج ذیل حرکات کرتا ہے اس کی نسبت یہ کہا جائے گا کہ اس نے ''زنا بالجبر'' کیا ہے، اگر وہ۔

(الف) اپنے عضو تناسل کو، کسی بھی حد تک، کسی عورت کی اندام نہانی، منہ، پیشاب گاہ (urethra) یا سوراخ مقعد (anus) میں داخل کرتا ہے یا اس سے اپنے ساتھ یا دیگر کسی شخص کے ساتھ ایسا کرواتا ہے؛ یا

(ب) کسی شے یا جسم کے کسی حصے کو، جو مردانہ عضو تناسل نہ ہو، کسی بھی

حد تک، کسی عورت کی اندام نہانی یا مقعد میں ڈالتا ہے یا اس سے اپنے یا کسی دیگر شخص کے ساتھ ایسا کرواتا ہے؛ یا

(ج) کسی عورت کے جسم کے کسی بھی حصے کو مروڑنے کی کارستانی کرتا ہے تاکہ اسے ایسی عورت کی اندام نہانی، پیشاب گاہ، مقعد یا جسم کے کسی حصے میں داخل کیا جاسکے یا اس سے اپنے یا کسی دیگر شخص کے ساتھ ایسا کرواتا ہے؛ یا

(د) اپنا منہ کسی عورت کی اندام نہانی، مقعد یا پیشاب گاہ پر لگاتا ہے یا اس سے اپنے یا کسی دیگر شخص کے ساتھ ایسا کرواتا ہے:

پہلی۔ اس کی مرضی کے خلاف؛

دوسری۔ اس کی رضامندی کے بغیر؛

تیسری۔ اس کی رضامندی سے جبکہ اس کی رضامندی اس کو یا اس شخص کو، جس میں اس کا مفاد ہو، موت یا ضرر کا خوف دلا کر حاصل کی گئی ہو؛

چوتھی۔ اس کی رضامندی سے، جبکہ وہ شخص یہ جانتا ہو کہ وہ اس کا شوہر نہیں ہے اور یہ کہ اس عورت نے رضامندی اس لیے دی ہے چونکہ وہ یہ باور کرتی ہے کہ وہ ایسا شخص ہے جس سے اس کی باضابطہ شادی ہوئی ہے؛

پانچویں۔ اس کی رضامندی سے، جب ایسی رضامندی دیتے وقت فتورِ عقل یا نشے کی وجہ سے یا اس شخص کے ذریعے ذاتی طور پر یا کوئی بے ہوش کرنے والی یا مضر شے دینے یا کسی دیگر شخص سے دلانے کی وجہ سے وہ اس قابل نہیں تھی کہ اس فعل کی نوعیت اور نتائج کو سمجھ سکے جس کے لیے اس نے رضامندی دی ہو؛

چھٹی۔ اس کی رضامندی سے یا رضامندی کے بغیر جبکہ وہ 18 سال سے کم عمر کی ہو۔

ساتویں۔ جب وہ اظہار رضامندی کے قابل نہ ہو۔

تشریح-1: اس دفعہ کی اغراض کے لیے، "اندام نہانی میں اس کے دونوں باہری fold شامل ہیں یعنی (The two labia majora outer folds of the vulva)

تشریح-2: رضامندی سے مراد بلا شرط رضامندانہ قرار ہے یعنی وہ صورت جب عورت ادائیگی الفاظ، اشارات یا زبانی طور پر یا دیگر کسی طریقے سے یا کسی بھی شکل میں مخصوص جنسی فعل میں شریک ہونے کے لیے رضامند ہو جاتی ہے۔

مگر شرط یہ ہے کہ اگر کوئی عورت دخول کے فعل کی جسمانی طور پر مزاحمت نہیں کرتی ہے تو صرف اس بنیاد پر یہ نہیں سمجھا جائے گا کہ اس نے اس جنسی فعل کے لیے اپنی رضامندی ظاہر کردی۔

استثنیٰ-1: کسی طبی عمل (medical procedure) یا مداخلت (intervention) سے جرم زنا بالجبر کی شکل نہیں لے گا۔

استثنیٰ-2: کسی شخص کی اپنی بیوی کے ساتھ جنسی مباشرت یا جنسی فعل زنا بالجبر نہیں ہے، جبکہ اس کی بیوی 15 سال سے کم عمر کی نہ ہو۔

بعض جرائم (بشمول زنا بالجبر) وغیرہ سے ستم رسیدہ شخص کی پہچان کا انکشاف

Disclosure of identity of the victim of certain offences, etc

دفعہ 228 الف: (1) جو کوئی کسی نام یا دیگر امر کو جس سے کسی ایسے شخص کی (جسے اس دفعہ میں اس کے بعد ستم رسیدہ شخص کہا گیا ہے) پہچان ہوسکتی ہے، جس کے خلاف دفعہ 376، دفعہ 376 الف، دفعہ 376 ب، دفعہ 376 ج یا دفعہ 376 د کے تحت کسی جرم کا کیا جانا مبینہ ہے یا کیا گیا پایا گیا ہے، طبع یا شائع کرے گا اس کو دونوں قسموں میں سے کسی قسم کی قید کی سزا دی جائے گی جس کی میعاد دو برس تک کی ہوسکتی ہے اور وہ جرمانہ کا بھی مستوجب ہوگا۔

(2) ذیلی دفعہ (1) کے کسی بھی امر کی وسعت کسی نام یا دیگر امر کی طباعت یا اشاعت پر اگر اس سے ستم رسیدہ شخص کی پہچان ہوسکتی ہے تب تک نہیں ہوتی ہے جب تک ایسی طباعت یا اشاعت۔

(الف) پولس تھانہ کے نگراں افسر کے یا ایسے جرم کی تفتیش کرنے والے پولس افسر کے جو ایسی تفتیش کی غرض کے لیے نیک نیتی سے کام کرتا ہے، ذریعہ یا اس کے تحریری حکم کے تحت کی جاتی ہے؛ یا

(ب) ستم رسیدہ شخص کے ذریعہ یا اس کی تحریری اجازت سے کی جاتی ہے؛

(ج) جہاں ستم رسیدہ شخص کی موت ہو چکی ہے یا وہ نابالغ یا فاترالعقل ہے وہاں ستم رسیدہ شخص کے قریبی رشتہ دار کے ذریعہ یا اس کی تحریری اجازت سے کی جاتی ہے۔

مگر شرط یہ ہے کہ قریبی رشتہ دار کے ذریعہ کوئی ایسی اجازت کسی تسلیم شدہ فلاحی ادارہ یا تنظیم کے میر مجلس یا معتمد کے، چاہے اس کا جو بھی نام ہو، علاوہ کسی شخص کو نہیں دی جائے گی۔

تشریح: اس ذیلی دفعہ کی اغراض کے لیے 'تسلیم شدہ فلاحی ادارہ یا تنظیم' سے مرکزی یا ریاستی سرکار کے ذریعہ تسلیم شدہ کوئی سماجی فلاحی ادارہ یا تنظیم مراد ہے۔

(3) جو کوئی ذیلی دفعہ 4 میں محولہ کسی جرم کی بابت کسی عدالت کے روبرو کسی کارروائی کے متعلق کوئی امر اس عدالت کی پیشگی اجازت کے بغیر طبع یا شائع کرے گا اس کو دونوں قسموں میں سے کسی قسم کی قید کی سزا دی جائے گی جس کی میعاد دو برس تک کی ہو سکتی ہے اور وہ جرمانہ کا بھی مستوجب ہوگا۔

تشریح: کسی عدالت عالیہ یا سپریم کورٹ کے فیصلہ کی طباعت یا اشاعت اس دفعہ کے معنی میں جرم کے درجہ میں نہیں آتی ہے۔

زنا بالجبر کی سزا (Punishment for rape)

دفعہ 376: (1) جو کوئی، ان صورتوں کے سوا جن کی نسبت ذیلی دفعہ (2) میں توضیح کی گئی ہے، زنا بالجبر کا ارتکاب کرے، اسے دونوں میں سے کسی بھی قسم کی اس مدت تک کی قید بامشقت کی سزا دی جائے گی جو 7 سال سے کم نہ ہو لیکن جو عمر قید تک کی ہو سکتی ہے اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

(2) جو کوئی—

(الف) پولس افسر ہوتے ہوئے زنا بالجبر کا ارتکاب کرے—

(i) ایسے تھانے کی حدود کے اندر جہاں وہ تعینات ہو؛ یا

(ii) کسی اسٹیشن ہاؤس کے احاطے میں؛ یا

(iii) کسی ایسی عورت کے ساتھ جو اس کی یا اس کے ماتحت کسی پولس افسر کی تحویل میں ہو؛ یا

(ب) سرکاری ملازم ہوتے ہوئے، کسی ایسی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کا ارتکاب کرے جو ایسے سرکاری ملازم کی یا اس کے ماتحت سرکاری ملازم کی تحویل میں ہو؛ یا

(ج) مرکزی یا ریاستی حکومت کے ذریعہ کسی علاقے میں تعینات مسلح افواج کا رکن ہوتے ہوئے ایسے علاقے میں زنا بالجبر کا ارتکاب کرے؛ یا

(د) جیل، ریمانڈ ہوم یا کسی فی الوقت نافذ قانون کے ذریعے یا اس کے تحت قائم کی گئی تحویل کی دیگر جگہ یا عورتوں یا بچوں کے ادارے کی انتظامیہ یا عملے کا رکن ہوتے ہوئے ایسی جیل، ریمانڈ ہوم، جگہ یا ادارے کے کسی مکین کے ساتھ زنا بالجبر کرے؛ یا

(ہ) کسی اسپتال کی انتظامیہ یا عملے کا رکن ہوتے ہوئے کسی ایسی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کرے جو اس اسپتال میں ہو؛ یا

(و) کسی عورت کا رشتہ دار، ولی یا استاد یا امانت دار یا حاکم ہوتے ہوئے ایسی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کرے؛ یا

(ز) فرقہ وارانہ یا فرقہ پرستانہ تشدد کے دوران زنا بالجبر کرے؛ یا

(ح) کسی ایسی عورت کے ساتھ یہ جانتے ہوئے کہ وہ حاملہ ہے زنا بالجبر کا ارتکاب کرے؛ یا

(ط) کسی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کا ارتکاب کرے جبکہ وہ 16 سال سے کم عمر کی ہو؛ یا

(ی) اجتماعی زنا بالجبر کا ارتکاب کرے،؛ یا

(ک) کسی ایسی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کا ارتکاب کرے جو اپنی رضامندی ظاہر کرنے کے لائق نہ ہو؛ یا

(ل) کسی ایسی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کا ارتکاب کرے جو اس کے کنٹرول (نگرانی) یا اثر (Dominance) میں ہو؛ یا

(م) کسی ایسی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کا ارتکاب کرے جو کسی جسمانی یا ذہنی معذوری کا شکار ہو؛ یا

(ص) جو کسی ایسی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کا ارتکاب کرتے ہوئے، اسے شدید جسمانی مضرت پہنچائے، یا اس کے کسی عضو کو بیکار کر دے یا اس کی شکل بگاڑ دے یا اس کی جان خطرے میں پڑ جائے؛ یا

(ف) اسی عورت کے ساتھ بار بار زنا بالجبر کرے۔

اسے اس مدت تک کی قید بامشقت کی سزا دی جائے گی جو 10 سال سے کم نہ ہو لیکن جو عمر قید تک ہو سکے گی یعنی اس کی بقایا قدرتی زندگی تک اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا:

تشریح: اس ذیلی دفعہ کی اغراض کے لیے—

(الف) ''مسلح افواج'' سے مراد ہیں بحری، بری اور ہوائی افواج اور اس میں شامل ہیں فی الوقت نافذ قانون کے تحت تشکیل کی گئی مسلح افواج بشمول نیم فوجی جمعیت (paramilitary forces) و معاون جمعیت (auxiliary forces)،

(ب) ''اسپتال'' سے مراد اسپتال کا احاطہ ہے اور اس میں دوران بحالی صحت اشخاص یا ان اشخاص کو جنھیں طبی توجہ یا بحالی کی ضرورت ہو، رکھنے اور ان کے علاج کے لیے کسی ادارے کا احاطہ شامل ہے۔

(ج) ''پولیس افسر'' کی اصطلاح کے وہی معانی ہوں گے جو اس کے پولیس ایکٹ، 1861 میں ہیں۔

(د) اصطلاح ''عورتوں یا بچوں کا ادارہ'' سے ایسا ادارہ مراد ہے، خواہ اسے یتیم خانہ یا بے توجہی کی شکار عورتوں یا بچوں کا گھر یا بیوگان کا گھر یا کسی دیگر نام سے پکارا جائے، جو عورتوں یا بچوں کو رکھنے اور ان کی پرداخت کے لیے قائم کیا گیا اور چلایا جا رہا ہو۔

ستم رسیدہ کی موت واقع کرنے یا نتیجتاً اسے مسلسل بے خبری کی حالت میں پہنچانے کے لیے سزا

Punishment for causing death or resulting in persistent vegetative state of victim

دفعہ 376 الف: جو کوئی دفعہ 376 کی ذیلی دفعہ (1) یا ذیلی دفعہ (2) کے تحت قابل سزا کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے اور ایسے ارتکاب کے دوران کوئی ایسی مضرت پہنچاتا ہے، جس کے سبب عورت کی موت ہو جاتی ہے یا وہ عورت مسلسل vegetative state* (بے خبری کی حالت میں زندہ/ناکارہ زندگی)، اسے اس مدت تک کی قید با مشقت کی سزا دی جائے گی جو 20 سال سے کم نہ ہو لیکن جو عمر قید تک کی ہو سکتی ہے یعنی اس کی بقایا قدرتی زندگی تک کی، یا سزائے موت دی جائے گی۔

*A wakeful unconscious state that lasts longer than a few weeks is referred to as a persistent vegetative state

علاحدگی کے دوران شوہر کا اپنی بیوی کے ساتھ مباشرت کرنا

Sexual intercourse by husband upon his wife during separation

دفعہ 376 ب: جو کوئی، اپنی بیوی کے ساتھ، جو علاحدگی کی ڈگری یا کسی دیگر وجہ سے علاحدہ رہ رہی ہو، اس کی رضامندی کی بغیر جنسی مباشرت کرے، اسے دونوں میں سے کسی بھی قسم کی کم از کم 2 سال کی اور زیادہ سے زیادہ 7 سال کی سزائے قید دی جائے گی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

تشریح-1: اس دفعہ میں ''جنسی مباشرت'' سے کوئی بھی ایسا فعل مراد ہے جسے دفعہ 375 کے فقرہ جات (الف) تا (د) میں درج کیا گیا ہے۔

کسی با اختیار شخص کا کسی عورت کے ساتھ جنسی مباشرت کرنا

Sexual intercourse by a person in authority

دفعہ 376 ج: جو کوئی—

(الف) اپنی با اختیار یا اماتی حیثیت میں؛ یا

(ب) سرکاری ملازم ہوتے ہوئے؛ یا

(ج) کسی جیل، ریمانڈ ہوم یا کسی فی الوقت نافذ قانون کی رو سے یا اس کے تحت قائم کی گئی تحویل کی دیگر جگہ یا عورتوں یا بچوں کے کسی ادارے کا سپرنٹنڈنٹ یا منتظم ہوتے ہوئے؛ یا

(د) کسی اسپتال کی انتظامیہ یا عملے کا رکن ہوتے ہوئے اپنی اس حیثیت یا اماتی تعلق کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی تحویل یا اپنے تحت یا اسپتال کے حدود میں موجود کسی عورت کو اپنے ساتھ جنسی مباشرت کے لیے ترغیب دے یا بہلائے پھسلائے، اس کی یہ جنسی مباشرت زنا بالجبر کے درجے میں نہیں آئے گی اور اسے دونوں میں سے کسی بھی قسم کی کم از کم 5 سال کی قید با مشقت اور زیادہ سے زیادہ 10 سال تک کی سزا دی جائے گی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

تشریح-1: اس دفعہ میں ''جنسی مباشرت'' سے کوئی بھی ایسا فعل مراد ہے جسے دفعہ 375 کے فقرہ جات (الف) تا (د) میں درج کیا گیا ہے۔

تشریح-2: اس دفعہ کی اغراض کے لیے، دفعہ 375 کی تشریح 1 بھی لاگو ہوگی۔

تشریح-3: کسی جیل، ریمانڈ ہوم یا تحویل کی دیگر جگہ یا عورتوں یا بچوں کے کسی ادارے کی نسبت ''سپرنٹنڈنٹ'' میں وہ شخص شامل ہے جو ایسی جیل، ریمانڈ ہوم، جگہ یا ادارے میں کسی ایسے عہدے پر فائز ہو جس کی رو سے وہ اس کے مکینوں پر اختیار یا نگرانی کا استعمال کر سکے۔

تشریح-4: ''اسپتال'' اور ''عورتوں یا بچوں کا ادارہ'' سے بالترتیب وہی مراد ہوگا، جو ان سے دفعہ 376 کی ذیلی دفعہ (2) میں مراد ہے۔

اجتماعی زنا بالجبر Gang rape

دفعہ 376 د: جہاں ایک یا ایک سے زیادہ افراد کسی گروپ کی شکل میں یا بہ پیش رفت غرض مشترک کسی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کرتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک کی بابت یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے زنا بالجبر کے جرم کا ارتکاب کیا ہے اور اسے اس مدت تک کی قید با مشقت کی سزا دی جائے گی جو 20 سال سے کم نہ ہو لیکن جو عمر قید یعنی اس کی بقایا قدرتی زندگی تک کی ہو سکتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس پر جرمانہ بھی عائد ہوگا۔ **(بقیہ آئندہ)**

(ماخوذ خواتین سے متعلق جنسی و دیگر جرائم، قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)

دھوپ کا شہر

پروفیسر شاہدہ شاہین

شہر کے سربرآوردہ وکیل مجتبیٰ ہاشمی نے ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے سامنے اپنی کار روکی اور نیچے اتر آئے۔ وہ ایک سہ منزلہ عمارت تھی، روزمرہ ضرورتوں کی ہر ایک چیز وہاں دستیاب تھی۔ آج صبح دفتر روانگی کے وقت بیگم نے کچھ ضروری سامان پر مبنی ایک لسٹ ان کے ہاتھ میں تھما دی تھی جو گھر لوٹتے وقت لے جانا ضروری تھا۔ وہ جیسے ہی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اوپر پہنچے، خودکار دروازہ ان کے لیے کھل گیا۔ اندر داخل ہوئے تو ائرکنڈیشن کا فرحت بخش احساس ان کے رگ وپے میں سما گیا پر بھیڑ اتنی زیادہ تھی کہ تل دھرنے کے لیے بھی جگہ نہیں تھی۔ وکیل صاحب بمشکل راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھے اور مطلوبہ چیزیں اٹھا لینے کے بعد بل بنانے کے لیے شیطان کی آنت کی طرح لمبی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ اللہ اللہ کر کے جب ان کی باری آئی تو کاؤنٹر پر ایک جانی پہچانی شکل دکھائی دے گئی۔ وہ اس لڑکی کو دیکھتے ہی فوراً پہچان گئے جو گزشتہ ہفتہ ملازمت کے سلسلے میں ان کے دفتر آئی تھی۔

لڑکی نے بل بنا کر دیا انہوں نے پیسے ادا کر دیے۔ پھر وہ دوسرے گاہک کی طرف متوجہ ہو گئی۔ انہوں نے محسوس کیا تھا کہ کسی بھی گاہک کی طرف بغور دیکھنے کی اس کے پاس فرصت نہیں تھی لیکن کچھ آوارہ قسم کے لڑکوں کی ایک ٹولی تھی جو اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں لگی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر وکیل صاحب کو بہت برا لگا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو آنکھ مارتے ہوئے اسے الجھائے رکھنے کی تگ ودو میں ایک دوسرے پر پلے پڑ رہے تھے اور وہ لڑکی ان بے لگام امیرزادوں کی چھچھوری حرکتوں سے غمگین اور بری طرح خوفزدہ لگ رہی تھی۔ وکیل صاحب کو اس کی حالت پر فوری افسوس ہوا، مشینی انداز میں اپنا بل ادا کیا اور سامان کے تھیلے سنبھالتے ہوئے آگے بڑھ گئے کیونکہ ان کو جلد از جلد گھر جانا تھا۔ اس کے بعد دوپہر کا کھانا کھا کر فوراً دفتر پہنچنا تھا۔ ابھی ابھی دفتر سے فون آیا تھا کہ کئی ایک موکل کافی دیر سے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔

اچھی صورت بھی کیا بری شے ہے...... یہ مصرعہ بار بار ان کے ذہن میں گونج رہا تھا۔ اسی بنا پر تو وہ لڑکی ان کے یہاں نوکری حاصل کرنے سے رہ گئی تھی۔ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے ان کے تصور میں وہ منظر در آیا جب اسے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ وہ بہت عجلت میں تھے اور ایک ضروری کیس کے سلسلے میں کسی سے ملنے کا قصد کر کے دفتر سے نکل رہے تھے کہ راہداری میں اس لڑکی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ انہیں دیکھتے ہی اس نے جلدی سے اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے فائل سے کچھ کاغذات نکال کر ان کے آگے کر دیے۔ اس سے پہلے کہ اپنا مدعا بیان کرتی انہوں نے سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیا...... وہ غیر معمولی طور پر حسین تھی لیکن صاف ظاہر تھا کہ حوادث زمانہ نے اس کے چہرے سے رعنائی چھین لی تھی۔ اس کے سراپا پر چھائی ہوئی مردنی وکسمپرسی زبان حال سے کہہ رہی تھی کہ وہ بہت ضرورتمند ہے لیکن وکیل صاحب انکار میں اپنی گردن ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔ اس کے ذریعے پیش کی گئی سند اور صداقت نامہ دیکھنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی چہ جائیکہ اپنے انکار کے نتیجے میں اس کی آنکھوں میں جلتی ہوئی امید کی لو بجھ جانے پر چہرے کے سیاہ پڑ جانے کا منظر ملاحظہ کرتے۔ دراصل اس لڑکی کو دیکھتے ہی وکیل صاحب کو اپنے ان موکلوں کی یاد آ گئی تھی جن کو نوجوان اور حسین لڑکیوں کو اپنے دفتر میں

ملازمت دینے کا بھاری خمیازہ بھگتنا پڑا تھا۔

ان کے قریبی دوست، شہر کی ایک مشہور و معروف ملبوسات کی دکان کے مالک شبیر احمد کے بیٹے کو ایک ملازم لڑکی نے اپنی اداؤں کے جال میں اس طرح پھانس لیا کہ اس نے اپنے والدین کے علم میں لائے بغیر اس لڑکی سے شادی رچالی۔ شادی ہوتے ہی اس لڑکی نے خود کو تمام سیاہ وسفید کی مالکن گردان لیا اور سب پر اپنی دھاک جمانے لگی۔ اس کے بہیمانہ سلوک کے نتیجے میں معمر اور نمک خوار ملازموں کی جان آفت میں آگئی۔ دوکان مالک اس کا بال بھی بیکا نہ کر سکے۔ بالآخر وہ اس بکھیڑے سے اس قدر تنگ آگئے کہ بادلِ ناخواستہ اپنے اکلوتے بیٹے کو کاروبار میں آدھا حصہ دے کر قانونی طور پر الگ کرنا پڑا تھا۔

دوسرا واقعہ تھا، ان کے بچپن کے یار تفضل حسین کا جن کے یہاں ملازم لڑکی نے مجلس بہبودِ نسواں کی حمایت حاصل کر کے قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دیتے ہوئے اپنے مالک پر جنسی ہراسانی کا الزام لگایا تھا۔ وکیل صاحب کے ذریعے منت سماجت اور سمجھانے بجھانے پر بدقت تمام ایک موٹی رقم کے عوض قانونی چارہ جوئی سے باز رہنے پر رضامند ہوئی تھی۔ تفضل حسین وکیل صاحب کے لنگوٹیا یار تھے اور بال بچے دار آدمی تھے۔ وہ ان کی طبیعت سے بخوبی واقف تھے اور یقین کامل تھا کہ وہ کسی بھی

> **”ان کے قریبی دوست، شہر کی ایک مشہور و معروف ملبوسات کی دکان کے مالک شبیر احمد کے بیٹے کو ایک ملازم لڑکی نے اپنی اداؤں کے جال میں اس طرح پھانس لیا کہ اس نے اپنے والدین کے علم میں لائے بغیر اس لڑکی سے شادی رچالی۔ شادی ہوتے ہی اس لڑکی نے خود کو تمام سیاہ و سفید کی مالکن گردان لیا اور سب پر اپنی دھاک جمانے لگی۔ اس کے بہیمانہ سلوک کے نتیجے میں معمر اور نمک خوار ملازموں کی جان آفت میں آگئی۔ دوکان مالک اس کا بال بھی بیکا نہ کرسکے۔ بالآخر وہ اس بکھیڑے سے اس قدر تنگ آگئے کہ بادل ناخواستہ اپنے اکلوتے بیٹے کو کاروبار میں آدھا حصہ دے کر قانونی طور پر الگ کرنا پڑا تھا“**

حالت میں اس قدر رذیل حرکت کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔ حقیقت حال سے واقف ہونے کے باوجود مفت کی بدنامی اور تشہیر سے بچنے کے لئے لڑکی کو منہ مانگی رقم دینی پڑی۔ اگر وہ شریف زادی ہوتی تو یوں رقم لے کر نہ نکل جاتی۔

بظاہر معصوم اور بے ضرر دکھائی دینے والی ان لڑکیوں کے شاطرانہ حرکتوں پر وہ ششدر رہ گئے تھے۔ ایسے بے شمار واقعات سے دوچار ہونے کے بعد صنفِ نازک پر سے ان کا اعتماد ہی اٹھ گیا حتیٰ کہ کسی بھی صورت میں اپنے دفتر میں جوان لڑکیوں کو ملازمت نہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

آزادیٔ نسواں اور عورتوں کو عطائے اختیار کے نام پر جو تحریک تو چلی ہے بلا شک وشبہ بجلی ہاشمی بھی ابتدا ہی سے اس کے پرخلوص حامی رہے تھے بلکہ اس تحریک سے متعلق کئی ایک جلسے تو خود ان کی صدارت میں منعقد ہوئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حقوق نسواں کی سلامتی کے لئے قانونی ترامیم و اصلاحات کے نتیجے میں دفاتر اور خانگی زندگی میں شب و روز مظالم کی چکی میں پس رہی بے شمار خواتین کو تحفظ اور راحت نصیب ہوئی ہے......سالوں سے چل رہے مقدمات کا پانسہ پلٹ گیا ہمظلوم کی فوری دادرسی ہونے لگی لیکن اس کا ایک تلخ اور تاریک پہلو بھی جلد ہی ان کے آگے وا ہو گیا۔ اس کارآمد تحریک کے نکات و اغراض اور اپنے حقوق کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے کئی ایک خواتین کے ذریعے صنفِ مخالف کو بے وجہ ہراسانی، پرانی عداوت کی بنا پر ناحق استحصال کا نشانہ بھی بننا پڑا۔ اس نوعیت کے متعدد مقدموں کی پیروی وہ خود کر چکے تھے۔ پس کچھ ایک ناخوشگوار حادثات کے مدنظر معاشرے میں ایک غیر یقینی سا ماحول پیدا ہو گیا، لوگوں کو خواہ مخواہ کے بکھیڑوں سے دور رہنے میں ہی عافیت نظر آئی۔ انجام کار خواتین اور لڑکیوں کو ذی عزت اور واجب التعظیم غیر سرکاری مراکز میں کام ملنا دشوار ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے، ویسے ان کا اپنا ذاتی تجربہ یہی کہتا تھا کہ جہاں تک ایماندارانہ ذمہ داری نبھانے کا تعلق ہے صنفِ مخالف کے مقابلے میں لڑکیاں نمایاں طور پر محاسب اور کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن کیا کرتے دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے والی مثل کے مترادف برسوں پہلے لئے گئے فیصلے پر سختی سے کاربند تھے۔

نصیب، ملازمت حاصل کرنے کے چکر میں مختلف دفتروں کی خاک چھانتے چھانتے عاجز آ چکی تھی لیکن ہمت نہیں ہاری تھی۔ درحقیقت اس کی حاجت ہی کچھ اس نوعیت کی تھی کہ کسی طور جلد از جلد آمدنی کا ذریعہ پیدا کرنا لازمی ہو گیا تھا ورنہ گھر میں ایک وقت روٹی کے بھی لالے پڑ جاتے۔

نصیبہ اور اس کی دونوں چھوٹی بہنیں دور طالب علمی سے گزر رہی تھیں۔ان کے ابو کسی وکیل کے دفتر میں چپراسی تھے۔ان کی تنخواہ میں سب کو پیٹ بھر روٹی مل جاتی۔دیگر تعلیمی اخراجات اسکالرشپ سے ملنے والی رقم سے بمشکل پورے ہوتے تھے۔تینوں لڑکیاں بے حد محنتی اور ذہین تھیں جس کے پیش نظر وہ ان کے مستقبل سے بالکل مطمئن و بے فکر تھے۔نصیبہ قانون کی پڑھائی کر رہی تھی۔اس نے اپنے ابو کی ایما پر ہی اس کورس کا انتخاب کیا تھا کیونکہ بیٹی کو جج کے عہدے پر فائز دیکھنے کا انہیں بڑا اشتیاق تھا۔

خلاف توقع اچانک حالات نے کچھ اس طرح پینترا بدلا کہ ان سب کی آنکھوں میں بسے ہوئے خواب جیسے آسمان کے تارے بن گئے، حتیٰ کہ ان کی روزمرہ زندگی کے شب و روز بھی ڈانواڈول ہوکر رہ گئے۔

اس رات نصیبہ کے ابو کو جانے کیا ہوا کہ ناگاہ نیند سے بیدار ہوکر سینے میں درد کی شکایت کی اور ماہی بے آب کی مانند تڑپنے لگے۔اس سے پہلے کہ ڈاکٹر بلایا جاتا،وہ بے حس و حرکت ہو چکے تھے۔ڈاکٹر نے آکر انہیں متوفی قرار دے دیا۔چشم زدن میں گھر کا اکلوتا کفیہ پرور فرد جاتا رہا۔سب کچھ اس قدر تیزی سے ہوا کہ سارے گنگ رہ گئے۔

انہوں نے مشکل وقت کے لئے کچھ بھی اٹھا کر نہیں رکھا تھا،ان کے مطابق بیٹیاں ہی ان کا کل سرمایہ تھیں۔دراصل سارے اخراجات بمشکل پورے ہونے کے بعد ان کی جیب کچھ اس طرح خالی ہوتی کہ مہینہ پورا ہونے تک ادھار کی نوبت آجاتی چہ جائیکہ پس انداز کرنے کے متحمل ہوتے۔

دفعتاً ساری ذمہ داری نصیبہ کے نازک کاندھوں پر آگئی تھی۔اس کی امی ٹھیٹھ خانہ دار خاتون تھیں جو گھریلو امور کے ماسوا کسی اضافی ہنر سے متعارف نہیں تھیں۔انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اچانک ایسی صورتحال پیدا ہو جائے گی۔وہ بھی بے حد رنجیدہ و پریشان ہو اٹھیں اور اپنے آپ کو کوسنے لگیں کہ چچے ہلانے کے علاوہ وہ کچھ اور بھی سیکھا ہوتا تو آج اتنی پشیمانی تو اٹھانی نہ پڑتی۔

نصیبہ تڑپ کر بولی۔"خدارا امی! اس طرح خود پر لعنت و ملامت تو نہ کریں۔فکر اور رنج و غم کے مارے اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو اس بھری دنیا میں کون ہمارا پرسان حال ہوگا۔"پھر سر اٹھا کر خود اعتمادی کے ساتھ بولی۔"جب تک آپ کی یہ بیٹی ہے نا آپ کو چنداں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"وہ غیر یقینی انداز میں بیٹی کا چہرا دیکھنے لگیں۔

"ابو نے مجھے قانون کے کورس میں یونہی داخلہ نہیں دلوایا تھا۔وہ جانتے تھے کہ ان کی بیٹی کسی بھی نوعیت کے ہنگامی حالات سے دودو ہاتھ کرنا بخوبی جانتی ہے۔آپ دیکھنا نصیبہ ان ساری مشکلات سے یوں نپٹ لے گی۔"اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا تھا۔اس کی تسلی آمیز باتوں سے دونوں چھوٹی بہنوں کے چہروں پر رونق آگئی اور اس کی امی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔سب نے مل کر رات کا کھانا کھایا۔ایک عرصہ بعد حبیبہ اور طیبہ کے معصوم چہروں پر مسکراہٹ دیکھ نصیبہ کے دل کو بہت سکون ملا۔

یہ الگ بات تھی کہ ان کی ڈھارس بندھانے کے لئے نصیبہ نے یوں ہی ڈینگ ہانک دی تھی،حقیقت یہ تھی کہ اسے اپنے آگے صرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دے رہا تھا۔ناگاہ ابو کا مہربان سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد کسی طور سوچ نہیں رہا تھا کہ حالات پر کیسے قابو پایا جائے۔

"آزادی نسواں اور عورتوں کو عطائے اختیار کے نام پر جو تحریک نوچلی ہے بلا شک و شبہ مجتبیٰ ہاشمی بھی ابتدا ہی سے اس کے پر خلوص حامی رہے تھے بلکہ اس تحریک سے متعلق کئی ایک جلسے توخود ان کی صدارت میں منعقد ہوئے تھے .اس میں کوئی شک نہیں کہ حقوق نسواں کی سلامتی کے لئے قانونی ترامیم و اصلا حات کے نتیجے میں،دفاتر اور خانگی زندگی میں شب و روز مظالم کی چکی میں پس رہی بے شمار خواتین کو تحفظ اور راحت نصیب ہوئی ہے ......سالوں سے چل رہے مقدمات کا پانسہ پلٹ گیا ,مظلوم کی فوری دادرسی ہو نے لگی لیکن ا س کا ایک تلخ اور تاریک پہلو بھی جلد ہی ان کے آگے وا ہو گیا"

اتنی بڑی دنیا میں مدد مانگنے کے لئے کس در پر جائے......بے بسی اور نارسائی کے تلخ احساس کے زیر اثر اس کا گلا بھر آیا اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔سب کو سویا جان کر اپنے آنسوؤں کو بہہ جانے دیا لیکن حلق سے آزاد ہونے پر بضد سسکیوں کو بمشکل اندر ہی روک لیا۔اچانک اپنے سر پر کسی کے شفقت بھرے ہاتھ کا لمس محسوس کر کے پیچھے گھوم کر دیکھا تو اس کی امی سرہانے کھڑی ہوئی تھیں۔اس نے ماں کی گود میں اپنا منہ چھپا لیا اور بولی۔

"امی،میرا دماغ ماؤف ہو چکا ہے اب آپ ہی بتائیے کہ کہاں

سے شروعات کروں۔''

انہوں نے ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔ ''فکر کرنے سے بھی کسی کو کچھ حاصل ہوا ہے بھلا! جس نے یہ مصیبت دی ہے وہی اسے دور کرے گا۔ میری رائے میں تجھے وکیل صاحب کے دفتر جا کر اپنی قسمت آزمانا چاہئے جہاں تیرے ابو کام کرتے تھے۔''

وکیل صاحب کو شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں ان کے ہاتھوں کسی ضرورتمند کے ساتھ بے انصافی تو نہیں ہوئی، کسی معصوم کی حق تلفی تو نہیں ہوگئی۔ اسی سوچ میں غلطاں وہ اپنے دفتر پہنچ گئے۔ ان کی اسسٹنٹ جو ایک ادھیڑ عمر عورت تھی ان کے اندر داخل ہوتے ہی مودبانہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور دراز سے ایک لفافہ نکال کر آگے بڑھا دیا۔

''یہ کس نے دیا۔'' اس پیرنگ لفافے کو کھولتے ہوئے انہوں نے سوال کیا۔

''جناب، یہ لفافہ تو وہ لڑکی دے گئی تھی جو اس دن آپ سے ملنے آئی تھی اور میں اسے دراز میں رکھ کر بھول گئی۔'' وہ نظریں جھکا کر بولی۔

وکیل صاحب ایک دم اس پر برس پڑے۔ ''آج کل تم کچھ زیادہ ہی بھولنے لگی ہو، لگتا ہے کہ مرض نسیان سے دوچار ہو۔''

''عمر کا تقاضہ ہے جناب، مجھے احساس ہے کہ اکثر میری وجہ سے آپ کا نقصان ہو جاتا ہے، اس لئے گزارش ہے کہ کسی باصلاحیت اور جواں سال اسسٹنٹ کا تقرر کرلیں اور مجھے کوئی ہلکی پھلکی ذمہ داری والا کام دے دیں۔''

وکیل صاحب کا ذہن کہیں اور الجھا ہوا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خط کو پڑھ کر جیسے زمین میں گڑے جا رہے تھے۔ خط میں لکھا تھا...... جناب، میں آپ کے دفتر کے ایک ادنیٰ ملازم مرحوم رفیق انور کی دختر ہوں اور قانون کی طالبہ ہوں۔ ابو کہا کرتے تھے کہ میرا کورس پورا ہوتے ہی التجا کر کے آپ کی اسسٹنٹ لگوا دیں گے تاکہ ایک مشفق و مہربان سائے میں تربیت پا کر ان کی بیٹی بھی ایک کامیاب وکیل بن سکے...... شاید ابو نے اپنی اوقات سے کہیں بڑھ کر خواب دیکھ ڈالے تھے۔ میرے نصیب میں تو کورس پورا ہونا بھی نہیں لکھا۔ فی الحال مجھ پر اپنی چھوٹی بہنوں اور امی کی ذمہ داری آن پڑی ہے جسے نبھانے کے لئے مجھے ایک ملازمت کی فوری ضرورت ہے۔ اسی ضرورت کے تحت آپ کے دفتر میں اپنے ابو کی جگہ پر کرنے آئی تھی لیکن مجھے محسوس ہوا کہ آپ اس عہدے کے لئے کسی مرد کو ترجیح دیں گے...... دھوپ کے شہر میں اک سائبان ڈھونڈنے چلی آئی تھی۔ نہیں جانتی تھی کہ تقدیر نے اپنے دامن میں ذلت و رسوائی اور نہ جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھانا لکھا ہے۔

وکیل صاحب کی تصور میں ڈیپارٹمنٹل سٹور والا منظر گھوم گیا جہاں نسوانی حقوق اور عطائے اختیار وغیرہ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک معصوم اور بے ضرر خاتون کے وقار کو بلاخوف وخطر مجروح کیا جا رہا تھا اور پرسان حال کوئی نہیں تھا، پھر رفیق انور کا چہرا نگاہوں کے آگے آ گیا...... ایک انتہائی شریف، ایماندار اور خوددار انسان جس نے عام ماتحتوں کی طرح کسی ضرورت پر یا اپنے بچوں کے نام پر بھی کبھی ان کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اپنی مصروفیت کو کوسنے لگے جس کی وجہ سے اپنے پرانے ملازم رفیق انور کے سانحہ ارتحال کی خبر پا کر بھی تعزیت کے لئے ان کے غریب خانے پر نہیں جا پائے تھے حتیٰ کہ وہ واقعہ ان کے ذہن سے اتر گیا۔ انہیں خود پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ گو وہ مرتبے میں چھوٹے ضرور تھے لیکن اس قدر بھی بے اعتنائی...... ہمیشہ خود کو بڑے مردم شناس گردانتے آئے تھے۔ آج ان کی جوہر شناسی، اصول و اقدار سامنے کھڑے ہنسی اڑاتے ہوئے سے محسوس ہوئے۔ تصور میں باپ بیٹی دونوں کے چہرے گڈمڈ ہونے لگے۔ وہ فوراً باہر آئے اور گاڑی سٹارٹ کر کے نکل پڑے۔ ان کا رخ اس ڈیپارٹمنٹل سٹور کی طرف تھا جہاں نصیبہ کام کرتی تھی۔

''شایدابو نے اپنی اوقات سے کہیں بڑھ کر خواب دیکھ ڈالے تھے۔ میرے نصیب میں تو کورس پورا ہونا بھی نہیں لکھا۔ فی الحال مجھ پر اپنی چھوٹی بہنوں اور امی کی ذمہ داری آن پڑی ہے جسے نبھانے کے لئے مجھے ایک ملازمت کی فوری ضرورت ہے۔ اسی ضرورت کے تحت آپ کے دفتر میں اپنے ابو کی جگہ پر کرنے آئی تھی لیکن مجھے محسوس ہوا کہ آپ اس عہدے کے لئے کسی مرد کو ترجیح دیں گے...... دھوپ کے شہر میں اک سائبان ڈھونڈنے چلی آئی تھی۔ نہیں جانتی تھی کہ تقدیر نے اپنے دامن میں ذلت و رسوائی اور نہ جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھانا لکھا ہے''

تسکین زیدی

انتظار کے لمحوں کا کرب

کبھی کبھی انتظار کے لمحے کتنے گراں گزرتے ہیں۔ اس کا احساس آج مجھے یہاں آکر ہوا۔ میرا دوست توشاد اچانک بیمار ہو کر اسپتال میں داخل ہوا تھا، جسے دیکھنے کے لیے مجھے یہاں آنا ضروری تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ مریضوں سے ملنے کا وقت چار بجے سے سات بجے تک ہے اور میں اسی لحاظ سے یہاں چار بجے کے بعد آیا تھا، مگر مین گیٹ بند ملا۔ اس کے اوپر آویزاں بورڈ پر ملنے کا وقت پانچ سے سات بجے تک تحریر تھا۔ اور ابھی پانچ بجنے میں کافی دیر تھی۔ یہ وقت کیسے گزرے گا، سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ آس پاس کوئی ریستوران بھی نہیں تھا کہ وہاں بیٹھ کر ایک کپ چائے پی لی جاتی اور اخبار دیکھ لیا جاتا۔ میں اپنی جلد بازی کے سبب پریشان ہوا۔ مجھے اتنے پہلے نہیں آنا چاہیے تھا۔ مگر اب تو آ ہی گیا ہوں۔ میں ایک دو منٹ تو یونہی کھڑا رہا اور بے مقصد ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر کلائی کی گھڑی دیکھی۔ اب بھی وقت باقی تھا۔ اب کیا کروں میں سوچنے لگا۔

گیٹ کے باہر بیٹھنے کے لیے کوئی بنچ بھی نہیں تھی کہ ذرا دیر ستا لیتا۔ کوئی کب تک ایک جگہ کھڑا رہ سکتا ہے۔ آج اس کا احساس بخوبی ہو رہا تھا۔ میرے علاوہ کئی اور لوگ اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے بے چین تھے اور بار بار اپنی کلائیوں کی گھڑیاں دیکھ رہے تھے۔ اُدھر گیٹ مین سب سے لاتعلق اندر کرسی پر بیٹھا آرام سے کوئی فلمی پرچہ دیکھ رہا تھا۔ شاید گیٹ سے دور اس نے اپنی کرسی اس لیے بچھائی تھی کہ وہ آنے والوں کے غیر ضروری سوالات سے بچ سکے۔

باہر کھڑے لوگ ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ اسی لیے بت بنے لاتعلقی کے ساتھ ایک دوسرے کو تھکی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

انتظار کی کسک سب کے چہروں سے عیاں تھی۔ میں بی۔ آئی۔ سی کے قائم کردہ اس مشہور اسپتال کی پُرشکوہ عمارت کو بغور دیکھنے لگا۔ اس کی صاف شفاف بلڈنگ، خوبصورت لان ایک نظر میں سب کو اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں۔ چہار سمت سناٹا اور گہری خاموشی یہاں کے نظم و نسق کا پتہ بتا رہی تھی۔ کسی زمانے میں یہاں انگریزوں کا ہی علاج ہوتا تھا۔ آزادی کے بعد یہ عوام کے لیے کھول دیا گیا ہے اور اب بی۔ آئی۔ سی گروپ کے ملوں اور فیکٹریوں کے ملازمین کا علاج معالجہ یہاں ہوتا ہے۔ اس گروپ کے مل اور فیکٹریاں کچھ تو بند ہو گئیں اور کچھ کا وجود سسک رہا ہے مگر میک رابرٹ اسپتال میں اب بھی جوں کا توں شان سے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ سنا ہے کہ یہاں کے قوانین بہت سخت ہیں۔ ڈاکٹروں کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ کسی کو اس سے اختلاف کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ وقت کی پابندی انگریزوں کی دین ہے اور یہ اب تک یہاں قائم ہے۔ میک رابرٹ اسپتال کا نام ذہن میں آتے ہی ڈاکٹر دتا اور ڈاکٹر اطہر کی مہربان صورتیں نظر میں سما جاتی ہیں۔ دتا صاحب میں خدمتِ خلق کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے اور اطہر صاحب جو ان کے دستِ راست ہیں، اپنی نرم گفتاری اور انسان دوستی کے لیے مشہور ہیں۔ وہ یہاں کے گوشے گوشے میں یوں بسے ہوئے ہیں، جیسے دل میں دھڑکن اور پھول میں خوشبو ہوتی ہے، ان کے بغیر یہاں کا تذکرہ نامکمل سا لگتا ہے۔

میں نے گھوم کر دیکھا۔ اب کچھ اور لوگ بھی یہاں آگئے تھے اور اچھی خاصی بھیڑ جمع ہوگئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ اسپتال کا گیٹ نہیں کسی مل یا فیکٹری کا صدر دروازہ ہے، جہاں مزدور اپنے مطالبوں کے لیے دھرنا دے رہے ہیں یا ہڑتال کرنے کے لیے بے چین کھڑے ہیں۔

اب کچھ لوگ سرگوشیوں میں اور کچھ بلند آواز میں گفتگو کرنے لگے تھے۔ شاید اس لیے کہ وقت کسی طرح جلد بیت جائے مگر انتظار کے لمحے مشکل سے گزرتے ہیں۔ ایک ایک لمحہ بھاری معلوم ہونے لگتا ہے۔ میرا دھیان پھر نوشاد کی بیماری کی طرف چلا گیا۔ پتہ نہیں اب وہ کس حالت میں ہوگا۔ اسے دیکھنے کے لیے آنکھیں بے چین تھیں۔ بڑا پیارا آدمی ہے۔ روتوں کو ہنسا دینے والا اور مصیبت میں ہر ایک کے کام آنے والا۔ مگر اس کی جیب ہمیشہ خالی رہتی ہے۔ فضول خرچ بہت ہے کہتا ہے کہ خرچ کرو خدا دے گا۔

گیٹ پر کھڑی بھیڑ کو دیکھ کر کچھ ٹھیلے والے قریب آگئے ان میں سے ایک پان سگریٹ والا، دوسرا چائے سموسے والا اور تیسرا لیا چنے والا موجود تھا۔ ٹھیلوں کے قریب آتے ہی لوگ ان کی طرف مڑ کر دیکھنے لگے۔

''مجھے ایک سگریٹ دینا''۔

''ایک پان مجھے چاہیے''۔

''ایک گلاس دودھ میرے بچی کے لیے دینا''۔

کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔

مجھے چائے کی خواہش ہوئی، میں چائے والے کے قریب پہنچ گیا۔ ابھی پانچ منٹ باقی تھے۔

''ایک کپ چائے دینا بھئی'' میں نے زور سے کہا۔

''سموسے بھی دوں صاحب، گرما گرم ہیں''۔ ٹھیلے والے نے پوچھا۔

''نہیں، تم نے پتہ نہیں کس تیل میں انھیں تلا ہے''۔ میں نے انکار میں کہا۔

''ارے صاحب! خالص گھی میں بنایا ہے۔ سرسوں کا تیل تو اب دیکھنے کو نصیب نہیں ہے۔ سب کچھ اندر ہو گیا''۔

میں نے اس کی بات سے کچھ مطمئن ہو کر پوچھا۔

''کتنے کا ہے؟''

''دو روپے کا ایک ہے صاحب''۔

''مہنگا ہے۔ سب جگہ تو ایک ڈیڑھ میں ملتا ہے''۔

''صاحب جی! جس ریٹ میں مٹیریل ہمیں ملے گا اسی دام تو ہم سموسے دیں گے۔ بناسپتی اب ۵۵۔۶۰ روپے کلو ہو گیا ہے اور آلو بھی مہنگا ہے۔ پھر اب بکری کتنی رہ گئی ہے دو گھنٹے کی یہاں سیل ہے پھر سناٹا''۔

''اچھا لاؤ دو سموسے۔ مگر گرم دینا''۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے دوسروں کو دیکھ کر چائے کے ساتھ سموسے بھی لیے''۔

سموسے کھا کر عجیب سی ڈکار آئی اور متلی بھی ہونے لگی۔ میں خوفزدہ ہو گیا، سوچنے لگا کیا اس میں بھی ملاوٹ ہے؟

ملاوٹ کا زہر اپنے اندر سرایت ہوتے ہوئے محسوس کر کے میں سہم گیا۔ کیا میں بھی ڈراپسی کا شکار ہو جاؤں گا۔ خدا نہ کرے ایسا ہو۔ پھر خود کو برا بھلا کہنے لگا۔ مجھے یہ سموسے نہیں کھانے چاہیے تھے۔ یہ تو خود بیماری کو دعوت دینا ہوا اور میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔

''تم نے مجھے کیسے سموسے کھلا دیے۔ مجھے متلی ہو رہی ہے اور سر چکرانے لگا ہے''۔

''صاحب جی! جس ریٹ میں مٹیریل ہمیں ملے گا اسی دام تو ہم سموسے دیں گے۔ بناسپتی اب ۵۵۔۶۰ روپے کلو ہو گیا ہے اور آلو بھی مہنگا ہے۔ پھر اب بکری کتنی رہ گئی ہے دو گھنٹے کی یہاں سیل ہے پھر سناٹا''۔
''اچھا لاؤ دو سموسے۔ مگر گرم دینا''۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے دوسروں کو دیکھ کر چائے کے ساتھ سموسے بھی لیے''۔
سموسے کھا کر عجیب سی ڈکار آئی اور متلی بھی ہونے لگی۔ میں خوفزدہ ہو گیا، سوچنے لگا کیا اس میں بھی ملاوٹ ہے؟''

اس درمیان دوسرے لوگ کھائی کر کے گیٹ کے اور قریب ہو گئے تھے۔ ٹھیلے والا بھی میری کیفیت دیکھ کر گھبرا گیا اور مجھے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''گھبرائیے نہیں صاحب! بالکل خالص گھی میں بنے ہیں آپ کو بلا وجہ شک ہو گیا ہے کسی نے اور ایسی شکایت نہیں کی۔ برسوں سے اسی جگہ ٹھیلا لگاتا ہوں ڈاکٹر اور نرسیں ہمیں سے سموسے منگوا کر کھاتے ہیں۔ یہ ملاوٹ کا کام تو بڑے دکاندار کرتے ہیں ہم تو منڈی میں تیل، گھی لاتے ہیں''۔

وہ اپنی صفائی دے رہا تھا اور میں ڈراپسی کے آثار خود میں ٹٹول رہا تھا۔ پہلے چکر آنے لگتا ہے، پھر منہ سے ڈکار آتی ہے اور پیٹ میں درد شروع ہو جاتا ہے، پیروں پر سوجن آجاتی ہے۔ اس میں مریض بے ہوش بھی ہو سکتا ہے۔ کیا میں بھی اسی کیفیت میں مبتلا ہو جاؤں گا؟

نوشاد بھی اسی طرح ڈراپسی کا شکار ہوا تھا۔ چاٹ کا شوقین تو وہ ہمیشہ سے رہا ہے۔ پھر ہر چیز کی زیادتی بھی تو نقصان دہ ہوتی ہے۔

دوستوں کے ساتھ بازار میں گرم گرم پکوڑیاں ڈھیری کھا گیا۔ گھر آتے ہی پیٹ میں درد اٹھیاں شروع ہو گئیں اور بے ہوش ہو گیا۔ پھر یہاں داخل کرانا پڑا۔ اب کہیں میرا نمبر نہ آجائے۔ میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹکا۔ جیب سے ایک الائچی نکالی اور اسے منہ میں ڈال کر چبانے لگا، جس سے کچھ سکون ملا اور کچھ دیر میں طبیعت بحال ہو گئی۔ میں بلاوجہ شک میں مبتلا ہو گیا تھا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ ابھی دو منٹ باقی تھے۔ اب یہ لمحے کیسے گزریں گے؟ میں اسی سوچ میں غرق تھا کہ ایک عورت کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''تمہارا دودھ خراب ہے۔ بچی نے سارا دودھ اگل دیا۔ دیکھو اس میں مہک آرہی ہے میرے پیسے واپس کرو۔ ورنہ پولیس میں شکایت کردوں گی''۔

''بہن جی! دودھ تو ٹھیک ہے آپ کی بوتل خراب ہوگی۔ آپ نے اسے گرم پانی سے دھویا نہیں ہوگا''۔

''الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے... بے ایمانی اور سینہ زوری''۔ عورت غرائی اور سبھی نے اس کا ساتھ دیا۔

ٹھیلے والے کو ناگواری سے دودھ کے پیسے لوٹانے پڑے۔

''سب کمزور کو دباتے ہیں طاقت ور سے کوئی کچھ نہیں کہتا''۔ وہ بڑبڑایا۔

''کیا زمانہ آگیا ہے ماحول میں آلودگی کے سبب سانس لینا دشوار ہے۔ ہر چیز میں ملاوٹ ہے کیا کھایا جائے اور کیا نہ کھایا جائے''۔

ماحول ایک دم بوجھل ہو گیا۔

کئی پولیس والے گیٹ کے پاس آگئے اور ڈنڈے پٹکا کر ٹھیلے والوں کو ڈانٹ بھگانے لگے۔

''بھاگو یہاں سے جلدی۔ کیوں بھیڑ اکٹھا کیے ہو؟''

فوراً ہی ٹھیلے والے اپنا اپنا سامان سمیٹتے ہوئے کہیں دور چلے گئے۔ یہ بیچارے پولیس کو خوش بھی کرتے ہیں اور ان کے ڈنڈے بھی کھاتے ہیں۔ میں ٹہلتے ہوئے پھر گھڑی دیکھنے لگا۔ تعجب ہے وقت کتنی سست روی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ تبھی ایک فیشن ایبل اور اونچے گھرانے کی عورت اپنی کار سے نیچے اتری اور ساڑی درست کرتے ہوئے گیٹ مین کو مخاطب کر کے بولی۔

اب تو پانچ بج گئے گیٹ کھول دو۔

دوسروں نے بھی اس کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ ''جی ہاں پانچ بج گئے''۔

مگر چوکیدار ٹس سے مس نہیں ہوا۔

''جی نہیں صاحب! ابھی ہماری گھڑی میں ایک منٹ باقی ہے۔ ہمارا ہر کام اسپتال کی گھڑی سے ہوتا ہے۔ یہ انگلینڈ سے بن کر آئی تھی۔ میک رابرٹ صاحب کا گفٹ ہے سو برس میں اس میں ایک سیکنڈ کا بھی فرق نہیں ہوا ہے۔ جب اس میں پانچ بجیں گے تب ہی یہ گیٹ کھلے گا''۔

''یہ تو سراسر دھاندلی ہے۔ ہم لوگ کب سے دھوپ میں کھڑے پریشان ہو رہے ہیں۔ اس کا بھی تمھیں خیال ہے''۔ ایک نوجوان ناراضگی سے بولا۔

''اگر میں نے ایک منٹ پہلے گیٹ کھول دیا اور ڈاکٹر صاحب ادھر آگئے تو وہ مجھے نوکری سے برخاست کردیں گے۔ وہ کسی کی ایک غلطی بھی معاف نہیں کرتے''۔ چوکیدار بولا اور سب کو ایک منٹ مزید انتظار کرنا پڑا۔ یہ منٹ پتہ نہیں کتنا طویل ہو گیا تھا اس کا اندازہ سب کے چہروں کی تکان سے عیاں ہو رہا تھا۔

> ''جی نہیں صاحب! ابھی ہماری گھڑی میں ایک منٹ باقی ہے۔ ہمارا ہر کام اسپتال کی گھڑی سے ہوتا ہے۔ یہ انگلینڈ سے بن کر آئی تھی۔ میک رابرٹ صاحب کا گفٹ ہے سو برس میں اس میں ایک سیکنڈ کا بھی فرق نہیں ہوا ہے۔ جب اس میں پانچ بجیں گے تب ہی یہ گیٹ کھلے گا''۔ ''یہ تو سراسر دھاندلی ہے۔ ہم لوگ کب سے دھوپ میں کھڑے پریشان ہو رہے ہیں۔ اس کا بھی تمہیں خیال ہے''۔ ایک نوجوان ناراضگی سے بولا۔''

کچھ ساعتوں بعد اچانک گیٹ کا تالا کھلنے کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔

''ٹن...ٹن'' اب اسپتال کا گھنٹہ پانچ بجنے کا اعلان کر رہا تھا۔ بے صبری میں سبھی لوگ اندر کی طرف تیزی سے بڑھنے لگے۔ انتظار کے لمحوں کا کرب ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے بھی اس سے چھٹکارا پا کر راحت کی سانس لی اور سرعت سے وارڈ نمبر چار کی طرف بڑھ گیا۔

□□□

پینٹنگ

افشاں ملک

حجلہ عروسی نہایت سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ سنہرے اور سفید منقیش کی جھالریں بجلی کی دودھیا روشنی میں جگمگ کر رہی تھیں۔ سیج پر گلاب کے پھولوں کا بستر تھا ساتھ ہی کئی طرح کی خوشبوئیں کمرے کی فضا کو معطر اور رومانی بنا رہی تھیں۔ سرخ عروسی جوڑا زیب تن کیے ہوئے وہ پھولوں سے سجے بستر پر بیٹھی اپنے خوابوں کے شہزادے کی منتظر تھی لیکن اس کی نظر جیسے ہی سامنے کی دیوار پر لگی ہوئی پینٹنگ پر پڑی وہ تھر تھر کانپنے لگی، خوف کی ایک لہر تھی جو اس کے سر سے اٹھتی ہوئی ریڑھ کی ہڈی تک سرایت کر گئی وہ بار بار رومال سے اپنے چہرے اور ماتھے کا پسینہ پونچھ رہی تھی۔ اس کا شوہر عارف ابھی باہر اپنے دوستوں سے فارغ ہو کر نہیں آیا تھا۔

گھڑی کی ٹک ٹک لگاتار رات کے گزر جانے کا احساس دلا رہی تھی۔ زیبا نے ہر چند چاہا کہ وہ سامنے لگے ہوئے پورٹریٹ پر نظر نہ ڈالے لیکن جتنا وہ تصویر کو نہ دیکھنے کا فیصلہ کرتی اتنا ہی کوئی لاشعوری جذبہ اسے تصویر دیکھنے کے لیے مجبور کر دیتا، وہ اضطراری کیفیت میں نظر اٹھاتی اور پھر تصویر کی طرف دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتی۔

پورٹریٹ میں جھاڑیوں اور گنجان پیڑوں سے بھرا ہوا ایک جنگل دکھایا گیا تھا جس میں گھنی کنٹیلی جھاڑیوں کی اوٹ میں ایک خوفناک تیندوا چھوٹی سی ہرنی کو دبوچے ہوئے تھا اور اس کے تیز نوکیلے دانت ہرنی کے گلے میں پیوست تھے۔ زیبا نے پھر ایک بار پورٹریٹ کی طرف دیکھا اور خوف سے لرز اٹھی۔ اس نے محسوس کیا کہ ڈر کی شدت سے اس کا پورا جسم پسینے سے بھیگ گیا ہے۔ تبھی دروازے پر ہلکے قدموں کی چاپ ہوئی۔ عارف نے کمرے کے اندر آ کر دروازہ بند کیا اور والہانہ انداز میں دلہن کی سیج کی طرف بڑھ گیا۔

برابر کے کمرے سے نوجوان لڑکیوں کے سہاگ گانے کی سریلی آوازیں اب تک آ رہی تھیں۔ کبھی کبھی کسی لطیفے پر قہقہے گونج اٹھتے۔ عورتیں جب سہاگ گاتی ہیں تو اس میں کئی دلچسپ پہلو عریانیت کے بھی ابھر آتے ہیں۔ زیبا خوف گرفتہ ہونے کے باوجود محسوس کر رہی تھی کہ ہمارے یہاں لوک گیتوں کی روایت میں جنسی زندگی کے کتنے مزے دار پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے لیکن خاص اس وقت جب گیتوں کے یہ بول اس کے کان میں پڑ رہے تھے تو اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے ذہن میں فرحت کی جگہ تلخیاں بھرتی جا رہی ہیں۔

عارف نے دھیرے سے زیبا کے بالمقابل بیٹھ کر شدت جذبات سے مغلوب ہو کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں بھر لیا۔

''ارے یہ تو برف کی طرح سرد ہے۔۔۔۔ اتنا ٹھنڈا۔۔۔۔؟''

عارف نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے زیبا سے پوچھا اور پھر پیار سے اپنی ہتھیلی زیبا کے ماتھے پر رکھ دی۔ ماتھا پسینے سے بھیگا ہوا تھا اور وہ بھی سرد تھا۔

''کیا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے زیبا؟''

عارف نے زیبا کو اپنے قریب کرتے ہوئے پوچھا۔ زیبا کوئی جواب نہیں دے سکی کیونکہ وہ جس ذہنی کشمکش میں مبتلا تھی اسے واضح کرنا اس وقت اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔

زیبا کے لیے عارف کوئی اجنبی شخص نہیں تھا۔ دونوں نے اسکول سے یونیورسٹی تک ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کی تھی۔۔۔۔ ایک دوسرے کو چاہا تھا۔۔۔ محبت کی تھی۔۔۔۔ زندگی بھر ساتھ رہنے کا وعدہ کیا تھا اور اس شادی سے دونوں مطمئن تھے کہ انھوں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی کو پا لیا تھا۔

عارف نے زیبا کو طالب علمی کے متعدد دلچسپ واقعات یاد دلا کر بہلانا چاہا اور زیبا نے بیتی ہوئی زندگی کے ان واقعات میں دلچسپی بھی لینا چاہی لیکن جیسے ہی گفتگو کے دوران اس کی نظر سامنے دیوار پر لگے

پورٹریٹ پر پڑتی وہ خوف کی شدت سے تھرا اٹھتی۔ چہرے پر پسینہ آ جاتا جسے وہ عارف پر ظاہر نہ ہونے دینے کے لیے آنچل میں چھپا کر صاف کرنے کی کوشش کرتی۔ زیبا جب کئی بار اس طرح کی کیفیت سے گزری تو عارف کو احساس ہوا اور اس نے زیبا کی گھبراہٹ اور سراسیمگی کا سبب جاننا چاہا لیکن زیبا اپنے ذہن کی گرہیں کھولنے کی ہمت نہیں کر سکی۔ اس نے ایک بار پھر نارمل ہونے کی سعی کی اور عارف سے گفتگو کرنے میں مشغول ہوگئی۔

"پورٹریٹ میں جھاڑیوں اور گنجان پیڑوں سے بھرا ہوا ایک جنگل دکھایا گیا تھا جس میں گھنی کٹیلی جھاڑیوں کی اوٹ میں ایک خوفناک تیندوا چھوٹی سی ہرنی کو دبوچے ہوئے تھا اور اس کے تیز نوکیلے دانت ہرنی کے گلے میں پیوست تھے۔ زیبا نے پھر ایک بار پورٹریٹ کی طرف دیکھا اور خوف سے لرز اٹھی۔ اس نے محسوس کیا کہ ڈر کی شدّت سے اس کا پورا جسم پسینے سے بھیگ گیاہے"

برابر کے کمرے سے گیتوں کی آوازیں آنی بند ہوگئی تھیں۔ شاید بیاہ کے ہنگاموں سے تھکی ہاری لڑکیاں اب سونے کے لیے بستروں پر چلی گئی تھیں۔ مرد بھی سارے ضروری کاموں سے فارغ ہو کر سوجانے کی تیاری میں تھے۔ کمرہ خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ زیبا کی ہتھیلیوں سے اٹھتی مہندی کی بھینی بھینی مہک نے جب عارف کو رومانی کیفیت سے دوچار کیا تو اس نے زیبا کو اپنے پہلو میں لٹانے کے لیے آہستہ سے اپنے ہاتھوں پر لے کر اس طرح بستر پر سجا دیا جیسے وہ پھولوں سے تراشا ہوا کوئی جسم ہو اس نے دھیرے دھیرے اس کے سارے زیور بھی اتار دیے جو اب اسے اپنے اور زیبا کے درمیان بے جا مداخلت کرتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ زیبا کو اس کے پورے وجود کے ساتھ اپنے سینے میں اتار لینا چاہتا تھا۔ اس نے وحشیانہ انداز میں زیبا کو پیار کیا لیکن کچھ ہی دیر میں پھر اسے محسوس ہوا کہ زیبا کا جسم بالکل سرد ہے اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں لرز رہی ہیں۔

عارف کی شدت جیسے کافور ہوگئی۔ اس نے گھبرا کر پوچھا

"زیبا تمہیں کوئی تکلیف ہے کیا؟ یا کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہو ---؟ کیا تم پیش آنے والے لمحات سے خوفزدہ ہو ڈیئر---؟"

"ہاں شاید"

زیبا نے مختصراً جواب دیا۔

"لیکن میں تمہارے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں ہوں ---تم مجھے بہت پہلے سے جانتی ہو۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے پوری طرح بے تکلف ہیں پھر تم اگر مجھ سے ڈر رہی ہو تو کیوں؟ میں تمہارے ساتھ تمہاری مرضی کے خلاف کوئی زیادتی نہیں کرونگا۔ تم پلیز ریلیکس ہو جاؤ۔"

زیبا نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن ایک اداس سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر ابھر کر معدوم ہوگئی۔ رات دھیرے دھیرے اپنے معینہ سفر پر آگے بڑھتی رہی۔ اس دوران عارف نے کئی بار زیبا کو اپنانا چاہا وہ سپر انداز ہوتی ہوئی محسوس بھی ہوئی اور اس پر سپردگی کی کیفیت بھی طاری ہوئی لیکن جلد ہی اس پر سراسیمگی کا دورہ پڑتا اور وہ ٹھنڈے پسینے میں شرابور ہو جاتی۔ آخر مشرق میں اجالا نمودار ہونے لگا گھروں کی دیواروں پر پرند چہچہانے لگے اور قریب کی مسجد سے مؤذن کی آواز نے گونج کر سحر ہو جانے کا اعلان کر دیا۔ عارف جو ساری رات جاگنے کی وجہ سے بری طرح تھک گیا تھا عجیب الجھن میں گرفتار تھا، زیبا کے ہاتھوں کو ہاتھ میں لے کر کہنے لگا۔۔

"زیبا مجھے لگتا ہے کہ تم وہ لڑکی نہیں ہو جسے میں اچھی طرح جانتا تھا اور جو میری سب سے اچھی دوست تھی جس کا کوئی روپ مجھ سے چھپا نہیں تھا وہ میرے لیے اور میں اس کے لیے ایک کھلی کتاب کی طرح تھے لیکن اب جس زیبا سے میں مل رہا ہوں وہ کوئی اور ہی ہے--- ایسا کیوں ہے میں جاننا چاہتا ہوں؟"

زیبا نے عارف کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا بلکہ سامنے دیوار پر لگے ہوئے پورٹریٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عارف سے پوچھا---

"عارف کیا تمہیں یہ تصویر پسند ہے؟"

"ہاں کیوں نہیں--- دیکھو اس میں کتنا فطری پن ہے! دیکھنے سے لگتا ہے کہ واقعی ہم کسی گنجان گھنے جنگل میں کھڑے ہیں اور تیندوا اپنے فطری انداز میں ہرنی پر جھپٹتا ہے اور جست لگا کر اسے دبوچ لینے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ آرٹسٹ نے اس مہارت سے اس منظر کی تصویر کشی کی ہے کہ دیکھ کر آدمی حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ تصویر میں تم دیودار کے گھنے لمبے پیڑوں کو دیکھو۔ ساتھ ہی وہ جھاڑیاں بھی بالکل اصلی لگ رہی ہیں جن کے پیچھے تیندوے نے ہرنی کو دبوچ رکھا ہے۔ تیندوے پر نظر ڈالو تو لگے گا کہ بس ابھی وہ ایک پل میں جی اٹھے گا۔ پکڑی گئی ہرنی کی آنکھوں میں جو خوف ہے اور بچاؤ کے لیے اس کے پاؤں جس طرح اٹھے ہوئے

ہیں اس نے تصویر کو کتنا حقیقی بنا دیا ہے۔۔۔!!!''

زیبا عارف کی زبان سے پینٹنگ کی تعریف سنتی رہی پھر کچھ سوچ کر بولی۔۔۔

''کیا یہ درندگی تمہیں اچھی لگتی ہے؟''

''یہ درندگی نہیں ہے زیبا فطرت کا قانون ہے۔۔۔! حیوانوں کی دنیا اس قانون سے بندھی ہے۔ یہاں زیادہ تر طاقتور حیوان اپنے سے کمزور جانداروں کو شکار کر کے اپنا پیٹ بھرتے ہیں یہ درندگی نہ ہو کر انھیں فطرت کی بھائی ہوئی زندگی بنائے رکھنے کی ایک راہ ہے۔ جنگل میں اگر یہ سب نہ ہو تو جنگل کے بھی گوشت خور جانور موت کا لقمہ بن جائیں۔''

عارف کی بات سن کر زیبا دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ جنگل کا یہ قانون اب نہ صرف حیوانوں بلکہ مہذب انسانوں میں بھی ہے۔۔۔ ابھی آدمی مہذب ہو کر بھی مہذب نہیں ہوا ہے۔ تبھی افراد خانہ کے جاگ اٹھنے سے چہل پہل شروع ہوگئی۔ عارف حجلہ عروسی چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

زیبا عروسی جوڑے میں اسی طرح گم سم سی سمٹائی بیٹھی رہی۔ کمرے میں لڑکیوں کا غول گھس آیا اور زیبا سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی، شادی شدہ خواتین کی تجربہ کار نظروں نے اندازے لگانے شروع کر دیے کہ عارف اور زیبا کی سہاگ رات کہیں تکرار کی نظر تو نہیں ہوگئی؟ کیونکہ ایسے موقعوں پر جو مسرت دولہا دلہن کے چہروں پر دکھائی دینی چاہیے وہ عارف اور زیبا دونوں ہی کے چہروں پر مفقود تھی۔ سب جانتے تھے کہ شادی دونوں کی پسند سے ہوئی ہے۔۔۔ پھر ایسی کیا بات ہوگئی۔۔۔؟ عارف کی والدہ میمونہ نے بھی جب زیبا اور عارف دونوں کو کچھ الجھا الجھا سا محسوس کیا تب فوراً عارف کو بلایا اور سرگوشی کے انداز میں اس سے اپنی تشویش کا اظہار بھی کر دیا۔۔۔ جواب میں عارف نے ان سے صرف اتنا کہا۔۔۔

''امی رات زیبا کی طبیعت خراب تھی۔ اسے بار بار ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے، معلوم نہیں کیوں؟'' عارف کی والدہ نے ڈاکٹر کو بلوا لیا۔ ڈاکٹر نے زیبا سے پوچھا۔۔۔

''آپ کیا تکلیف محسوس کر رہی ہیں؟''

زیبا الجھن میں گرفتار تھی مگر کچھ نہ کچھ تو بتانا ہی تھا۔۔۔

''میرے دل پر عجیب طرح کی گھبراہٹ اور خوف کا اثر ہے۔ مجھے نہیں معلوم یہ کیوں ہے؟ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا۔'' زیبا نے ڈاکٹر کو بتایا۔ ڈاکٹر نے نبض دیکھی اور آلہ لگا کر اس کی قلبی کیفیت کا اندازہ کیا۔۔۔

''میرا خیال ہے ڈپریشن کی شکایت ہے ان کو جو کسی وجہ سے بڑھ گئی ہے۔'' ڈاکٹر نے کچھ سکون آور دوائیں لکھ کر پرچہ عارف کو دے دیا اور زیبا کو آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

ایک ہفتہ گزر گیا لیکن زیبا کی کیفیت میں کوئی سدھار نہیں ہوا۔ وہ جب تک کمرے سے باہر رہتی نارمل دکھائی دیتی لیکن رات کو جب وہ عارف کے ساتھ بستر پر لیٹی ہوتی اور اس کی نظر سامنے دیوار پر لگی پینٹنگ کی طرف اٹھ جاتی تو اس کے ذہن پر سراسیمگی طاری ہو جاتی۔ عارف پورے ہفتہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار رہا۔ وہ نہیں جان پایا کہ زیبا کی اس دہشت زدگی کی وجہ دیوار پر لگی پینٹنگ ہے۔۔۔!!!

> '' رات دھیرے دھیرے اپنے معینہ سفر پر آگے بڑھتی رہی . اس دوران عارف نے کئی بار زیبا کو اپنانا چاہا وہ سپر انداز ہوتی ہوئی محسوس بھی ہوئی اوراس پر سپردگی کی کیفیت بھی طاری ہوئی لیکن جلد ہی اس پر سراسیمگی کا دورہ پڑتا اور وہ ٹھنڈے پسینے میں شرابور ہوجاتی ''

زیبا کئی بار سوچ کر بھی عارف کے سامنے کچھ بھی کہنے کا حوصلہ نہ کر سکی۔ ہفتہ بھر ذہنی سکون کے لیے استعمال کی گئی ادویات کے بعد بھی جب کوئی افاقہ نہیں ہوا تو ڈاکٹر نے عارف کو مشورہ دیا کہ وہ زیبا کو کسی اچھے Psychiatrist کے پاس لے کر جائے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق عارف نے ایک اچھے Psychiatrist کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور زیبا کو بتایا۔ زیبا شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا تھی۔ وہ ان سوالوں کا سامنا کرنے سے ڈر رہی تھی جو ڈاکٹر کی طرف سے پوچھے جا سکتے تھے۔

دونوں اگلے دن ڈاکٹر کے کلینک پہنچے تو ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق نرس نے عارف کو ویٹنگ گیلری میں رکنے کے لیے کہہ کر زیبا کو ڈاکٹر کے چیمبر میں پہنچا دیا۔ سفید پینٹ سے مرصع کمرے میں کسی طرح کی کوئی تصویر نہیں تھی، ماحول میں پر سکون سناٹا تھا۔ سامنے ڈاکٹر اپنے ہونٹوں پر شفیق مسکراہٹ لیے مریض کا منتظر تھا۔ اس نے زیبا کو بیٹھ جانے کے لیے کہا اور جب اسے محسوس ہوا کہ مریض نئے ماحول سے مانوس ہو گیا ہے تو اس نے ایک کے بعد ایک سوال زیبا سے پوچھنا شروع کیے۔

''کیا آپ کو بچپن میں اپنے والد یا بڑے بھائی کی سخت گیری کا سامنا کرنا پڑا ہے؟'' ڈاکٹر کا پہلا سوال یہ تھا۔

''نہیں۔۔۔! میرے والد اور بھائی مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں، یوں بھی میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہوں۔ اپنے گھر

میں سب ہی لوگوں کی خوب خوب محبت ملی ہے۔"

ڈاکٹر نے اگلا سوال کیا۔۔۔

"آپ کے خاندان یا جان پہچان کے حلقے میں کوئی ایسا مرد تو نہیں ہے جس سے آپ بچپن کی عمر میں ضرورت سے زیادہ خوف زدہ ہو گئی ہوں؟"

زیبا نے پھر انکار میں سر ہلایا اور کہا۔۔۔

"ڈاکٹر صاحب میں مہذب گھرانے کی فرد ہوں سب لوگ تعلیم یافتہ ہیں کوئی ایسا حادثہ میری زندگی میں نہیں گزرا جس میں خاندان کے کسی مرد نے مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش کی ہو۔"

"طالب علمی کے زمانے میں تو کسی ایسے نوجوان سے آپ کا سابقہ نہیں پڑا ہے جس نے آپ کی نفسیات پر شدید منفی اثر ڈالا ہو۔۔۔؟" ڈاکٹر کا اگلا سوال تھا۔ زیبا نے پھر انکار میں سر ہلایا، ڈاکٹر نے حیرت سے زیبا کی طرف دیکھا اور پوچھا۔۔۔

"پھر مرد ذات سے اتنا خوف کھانے کی وجہ؟"

زیبا نے ڈاکٹر کا سوال سنا اسے لگا کہ ڈاکٹر ایسا شخص ہے جو اس کے لیے شفیق بھی ہے اور خیر خواہ بھی۔ اس نے پر اعتماد نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور کہا۔۔۔

"ڈاکٹر صاحب میں مرد ذات سے خوف زدہ نہیں ہوں میں اس تصویر سے خوف زدہ ہوں جو میرے کمرے میں لگی ہے اور جس میں ایک تیندوے نے چھوٹی سی ہرنی کو اپنے خونخوار جبڑے میں دبوچ رکھا ہے۔"

ڈاکٹر نے مزید نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔۔۔

"آپ اگر اس تصویر سے ڈرتی ہیں تو اسکا بھی کوئی سبب ضرور ہوگا۔۔۔! کیا سبب ہے یہ میں نہیں جانتا لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اگر یہ تصویر آپ کے خوف کا سبب ہے تو اب تک اسے کمرے سے ہٹا کیوں نہیں سکیں؟"

ڈاکٹر کا سوال سن کر زیبا کچھ ٹپٹائی اور اپنے حواس درست کرتے ہوئے بولی۔۔

"ڈاکٹر میں تصویر ہٹانا چاہتی ہوں لیکن سوچتی ہوں کہ اگر عارف نے اس کا سبب جاننے کی کوشش کی تو میں انہیں بتا نہیں سکوں گی۔"

"کیا آپ کو عارف کی محبت پر بھروسا نہیں ہے؟"

"نہیں ڈاکٹر ایسی بات نہیں ہے۔ عارف بہت اچھا انسان ہے۔ وہ میرے لیے مخلص ہے، مجھ سے محبت کرتا ہے اور میرے تئیں کبھی کوئی غلط رائے قائم نہیں کریگا۔۔۔ لیکن پھر بھی میرے اندر ایک جھجک بنی ہوئی ہے جو مجھے پینٹنگ کے تعلق سے اس کے سامنے اظہار نہیں کرنے دیتی۔"

"دیکھیں آپ ہمت کریں۔۔۔ یہ فیصلے کی گھڑی ہے اگر آپ نے اس خوف کا اظہار عارف سے نہیں کیا تو ایک دن آپ دونوں کا رشتہ خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

ڈاکٹر نے زیبا کی ہمت بڑھائی اور دانستہ پینٹنگ کے تعلق سے زیبا سے پھر اور کوئی سوال نہیں پوچھا۔۔۔ از یبا عارف کے ساتھ واپس آ گئی۔ رات آئی تو پھر وہی کمرہ۔۔۔ وہی بیڈ۔۔۔ وہی دیوار۔۔۔ وہی پینٹنگ اور عارف زیبا کے پہلو میں لیٹا سوچ رہا تھا کہ زیبا کو نارمل حالت میں لانے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔۔۔؟

آدھی رات گزری تو عارف نے پھر اپنا گرم ہاتھ اس کے جسم پر رکھا اور اسے کھینچتے ہوئے اپنے قریب کیا ہی تھا کہ زیبا نے کانپتے ہوئے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔

"عارف سامنے دیوار کی اس پینٹنگ کو ہٹا دو مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔"

"ارے کیوں ڈر لگتا ہے۔۔۔ تصویر سے ڈرنے کا کیا سبب ہے زیبا، عارف نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔۔۔؟

"عارف اگر میں تمہیں ایک حادثے سے واقف کراؤں تو کیا تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گے۔۔۔؟

"نہیں، زیبا یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ میں تم سے نفرت کر ہی نہیں سکتا۔۔۔ میں نے تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہا اور اپنایا ہے۔۔۔ مجھے بتاؤ یہ تصویر تمہیں کیوں ڈراتی ہے؟"

"وہ ایک ہیبت ناک دوپہر تھی جب میری عمر بھی کوئی سات یا آٹھ سال رہی ہوگی۔ امی اور ابو صبح ہی سے رشتے داری میں کسی کے انتقال میں گئے ہوئے تھے، بھائی بھی گھر پر نہیں تھے۔ ایک پرانی ملازمہ جنہیں ہمارے گھر میں سب بوا کہتے تھے وہ اور ان کا جوان بیٹا مستقل طور پر ہمارے گھر رہتے تھے۔ دوپہر میں جب بوا سارے کام نمٹا کر وہیں دالان میں تخت پر لیٹیں تو انہیں نیند آ گئی۔ میں وہیں آس پاس ہی کھیل رہی تھی کہ ان کا جوان لڑکا مجھے بہلا کر گھر کے پیچھے باغ میں لے گیا اور پھر۔۔۔ پھر۔۔۔ اس نے اپنے خونخوار پنجے میرے کاندھوں میں اسی طرح پیوست کر دیے تھے جیسے تصویر میں اس تیندوے نے ہرنی کے گلے میں پیوست کر رکھے ہیں۔ ۔۔اور پھر۔۔۔"

زیبا شاید کچھ اور کہنے جا رہی تھی کہ عارف نے اس کے ہونٹوں پر اپنی انگلیاں رکھ کر اسے خاموش کر دیا اور اس سے آگے کچھ سننا نہیں چاہا، وہ تیزی سے اٹھا اور دیوار سے پینٹنگ اتار کر کھڑکی سے باہر پھینک دی اور واپس بستر پر آ کر زیبا کو اپنی آغوش میں لے لیا۔۔۔!!!

تن ریزہ ریزہ

ناہید اختر

"ایسا کیسے ہوجاتا ہے کہ ایک اجنبی اتنا قریب آجاتا ہے کہ اس کے لیے سارے رشتے ناطے، ساری محبتوں اور شفقتوں کو چھوڑ دینا سہل لگتا ہے۔ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے جو محبت وجود میں آئی وہ آدم اور حوا کی تھی۔ تو یہی رشتہ سب سے ازلی رشتہ ٹھہرا نا! اس لیے آج ایک بنت حوا اپنے پیاروں کی جنت چھوڑ کر ایک ابن آدم کے لیے زندگی کی سنگلاخ زمین پر کھڑی تھی"

سامنے زندگی کے صحرا میں جگمگاتی آرزوؤں کے سنہری سینگوں والے ہرن کلیلیں کررہے تھے۔ اور وہ لکشمن ریکھا کے پاس کھڑی گومگو میں تھی کہ آگے بڑھ کے انھیں پکڑ لے کہ لوٹ جائے۔

اروشی نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔ بڑی سبک روی سے روش پار کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے یہ خیال اس کے ذہن میں ضرور آیا کہ وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر جارہی ہے۔ کہیں چور ڈاکو نہ گھس جائیں۔ لیکن پھر اس نے "اونہہ" کہہ کے کندھے جھٹک دیے۔ تین تو بج ہی چکے ہیں۔ فوراً صبح ہوجائے گی۔ وہ آہنی گیٹ کھول کے باہر نکل آئی۔ حسب وعدہ باہر وہ دشمن جاں موجود تھا جس کے لیے اس نے یہ سب کچھ کیا تھا۔ ایسا کیسے ہوجاتا ہے کہ ایک اجنبی اتنا قریب آجاتا ہے کہ اس کے لیے سارے رشتے ناطے، ساری محبتوں اور شفقتوں کو چھوڑ دینا سہل لگتا ہے۔ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے جو محبت وجود میں آئی وہ آدم اور حوا کی تھی۔ تو یہی رشتہ سب سے ازلی رشتہ ٹھہرا نا! اس لیے آج ایک بنت حوا اپنے پیاروں کی جنت چھوڑ کر ایک ابن آدم کے لیے زندگی کی سنگلاخ زمین پر کھڑی تھی۔

احتشام حسین۔ جسے سب شامی کہہ کے بلاتے تھے دلی کے ایک ماہنامے کا سب ایڈیٹر تھا۔ اور اروشی، شہر کے جانے مانے سرمایہ دار سیٹھ ابراہیم رضا کی لاڈلی بیٹی ـــ وہ بچپن ہی سے بہت ذہین تھی۔ صورت بھی اللہ نے ایسی پیاری بنائی تھی کہ غیر بھی دیکھتے تو پیار کیے بغیر نہ رہتے۔ سیٹھ صاحب اسے بہت زیادہ چاہتے تھے۔ اس سے بڑی روشنی تھی۔ جواد ان دونوں سے بڑا اور فواد سب سے چھوٹا تھا۔ لیکن جو بات اروشی میں تھی وہ کسی میں نہ تھی۔ تین سال کی عمر سے پڑھائی شروع کی اور ہر سال امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کرتی گئی اور اب گریجویشن کا آخری سال تھا۔ بہت ہی ہنسنے ہنسانے والی زندہ دل لڑکی تھی۔ اپنے گروپ میں بے حد مقبول۔ چھ سات لڑکیوں کا گروپ تھا۔ جہاں جاتا ساتھ جاتا۔ یہ سب شہر کے متمول اور روشن خیال گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ہر جگہ آزادانہ آجا سکتی تھیں۔ کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ سیٹھ ابراہیم خود بہت آزاد خیال انسان تھے۔ انھوں نے اپنے بچوں سے علانیہ کہہ رکھا تھا کہ انھیں اپنی پسند کا شریک حیات چننے کا پورا اختیار ہے، لیکن یہ بات ضرور یاد رکھنا کہ تم کس فیملی سے تعلق رکھتے ہو۔ مجھے اپنے بچوں پر پورا پورا اعتماد ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میرے بچے میرے اعتماد کا خون نہ کریں گے۔ ابھی حال ہی میں ان کی بڑی بیٹی روشنی کا انگیجمنٹ ہوا تھا۔ صمد سیٹھ کے بیٹے جنید سے۔ اور یہ رشتہ روشنی اور جنید کی پسند سے ہوا تھا۔ سیٹھ ابراہیم نے خود لو میرج کی تھی۔ زبیدہ ان کی محبوبہ بھی تھیں اور شریک حیات بھی۔ بہت ہی کامیاب جوڑا تھا ان دونوں کا۔ اس لیے وہ لو میرج کے بالکل مخالف نہ تھے۔ اروشی کی سہیلیاں کہتیں تیرے تو مزے ہیں۔ بڑا پیارا پاپا ملا ہے۔ چن لے تو بھی اپنے لیے" ہاں۔ ہاں، کیوں نہیں"۔ وہ ہنستی اور" مجھے یقین ہے کہ میری پسند میرے پاپا کی پسند ہوگی"۔

لیکن ان کی وسیع النظری کی دیوار میں دراڑ اس دن پڑی جب جواد نے اپنے والدین سے پوشیدہ اپنی سکریٹری رومیلہ سے کورٹ

میرج کرلی۔ سیٹھ ابراہیم کو جب پتہ چلا تو آگ بگولہ ہوگئے اور کھڑے کھڑے جواد کو گھر سے نکال دیا۔ زبیدہ بیگم تو کلیجہ تھام کر رہ گئیں۔ جواد ان کی پہلی اولاد تھا۔ ان کی ممتا بھری کوکھ کا پہلا پہلا پھول۔ اسی نے تو اس لطیف و مقدس جذبے سے انہیں آشنا کیا تھا۔ وہ اس پر جان دیتی تھیں۔ شوہر کے بے رحمانہ سلوک سے ٹوٹ کر رہ گئیں۔ بیٹے سے بھی گلہ تھا کہ اس نے باپ کے اصولوں سے نافرمانی کیوں کی۔ لیکن اس سے اس کے بچھڑنے کا غم تو کم ہونے سے رہا۔ وہ گھنٹوں بالکونی میں کھڑی خالی نظروں سے سڑکوں کو دیکھا کرتیں۔ کہ شاید جواد ادھر سے گزر جائے اور ان کی پیاسی آنکھیں سیراب ہوجائیں۔ لیکن جواد گیا تو گیا۔ شاید اس نے شہر ہی چھوڑ دیا تھا۔ زبیدہ تو بیٹے کی جدائی میں بستر سے لگ گئیں۔ تب چار و ناچار سیٹھ ابراہیم نے اخبارات اور ٹی وی پر ماں کی بیماری اور جواد کے معافی کا پیغام نشر کرایا۔ جواد بھی بہت پریشانی کی زندگی گزار رہا تھا۔ رئیس زادہ تھا، کبھی کوئی جسمانی مشقت نہیں کی۔ حکم چلانے کی عادت تھی۔ اب دل کے ہاتھوں یوں خوار ہوا کہ ایک فرم میں چھوٹی سی جاب کر رہا تھا۔ رومیلہ بھی ادھر ادھر پارٹ ٹائم جاب کرتی پھر رہی تھی۔ باپ کا اعلان اخبارات میں پڑھ کر گویا سوکھے دھانوں پانی پڑا۔ ماں کی محبت کی کشش بھی رنگ لائی۔ پہلی ٹرین سے گھر پہنچا۔ باپ کے قدموں پر گر کر معافی مانگی۔ رومیلہ تو ساس کی پٹی پکڑ کر بیٹھ گئی۔ تن من دھن سے ان کی تیمارداری میں جت گئی۔ راتوں کو جاگ جاگ کر دوائیں دیتی۔ پرہیزی کھانے پکاتی۔ حد تو یہ ہے کہ PAN چھینکنے میں بھی اسے کوئی عار نہ تھا۔ زبیدہ حیرت انگیز طور پر صحت یاب ہوتی چلی گئیں۔ اور ایک دن انہوں نے رومیلہ کو "بہو" کہہ کر گلے سے لگا ہی لیا۔ اور رومیلہ کو اپنی ذات کا اعتبار مل گیا۔ اس نے اپنا آپ کو منوا ہی لیا آخر۔

ان کی صحت یابی کی خوشی میں ایک جشن منایا گیا۔ بہت دھوم دھام سے زبیدہ بیگم نے رومیلہ کے لیے ایک خوبصورت سا جوڑا سلوایا۔ جو بلیری ہوائی کہ انہیں رومیلہ کو بہ طور بہو سب سے متعارف کرانا تھا۔ اسی تقریب میں شامی بھی آیا۔ وہ رومیلہ کا فرسٹ کزن تھا۔ وہیں اس نے اروشی کو دیکھا جو گولڈن کلر کے لباس میں سنہری پری سی لگ رہی تھی۔ اور ایک جھلک میں ہی نقدِ دل و جان گنوا بیٹھا۔ اروشی کا حسن تھا ہی ہوش ربا۔ ویسے وہ بھی اچھا خاصا اسمارٹ نوجوان تھا۔ بات کرنے کا انداز بڑا دل نشین تھا۔ باتوں باتوں ہی میں دل جیتنے کا ڈھنگ جانتا تھا۔ سینکڑوں نہیں تو بیسیوں لڑکیاں ضرور اس کی نگاہِ التفات کی متمنی رہا کرتی تھیں۔ جب ہی تو اروشی بھی اسے نظر انداز نہ کرسکی۔ اس کے بہت سارے بوائے فرینڈز تھے۔ لیکن احتشام حسین شامی تو کوئی اور ہی چیز تھا۔ نگاہ اٹھی تو اٹھی ہی رہ گئی۔ اور پھر کچھ ایسا ہوا کہ وہ بنا کہے ہی ایک دوسرے کے دل کی بات جان گئے۔ محبت کی کرشمہ سازیوں سے کچھ بعید نہیں۔ پھر تو شامی ہاتھ دھو کے رومیلہ کے پیچھے پڑ گیا۔ "یار کزن کچھ کر، تیری سسٹر ان لا تو دیوانہ کر گئی۔ سیدھے دل کے سنگھاسن پر براجمان ہوگئی ہے۔ کچھ کر۔ نہیں تو تیرا یہ کزن گیا کام سے"۔ بے چاری رومیلہ کیا کرسکتی تھی۔ ابھی تو اس کے قدموں کے تلے زمین تھمی تھی۔ اس کی کیا مجال تھی کہ منہ سے بات بھی نکالتی۔ لیکن شامی نے ہار نہ مانی۔ دروازے کی دھول لے ڈالی۔ بہانے بہانے سے آنے لگا۔ کبھی ممی کے لیے فروٹس لا رہا ہے تو کبھی رومیلہ کے لیے پرفیوم۔ بات بات پر ملازمین کو بخشش دیتا۔ وہ تو جیسے کلمہ پڑھنے لگے شامی صاحب کا۔ اس طرح رفتہ رفتہ وہ گھر والوں سے قریب ہونے لگا۔ از راہِ میزبانی اروشی بھی اسے کمپنی دینے لگی۔ یوں بھی اس کے دل میں جواد کے لیے نرم گوشے تو موجود تھے ہی۔ اسے تو موقعہ کی تلاش تھی۔ سو قدرت نے فراہم کردیا۔ وہ کبھی ٹی۔ وی لاؤنج میں بیٹھے نظر آتے تو کبھی بیڈمنٹن کھیلتے۔ کبھی یوں ہی لان میں چہل قدمی ہورہی ہے۔ غرض کہ عشق کی بیل تیز روی سے پھولنے پھیلنے لگی۔ یہ دیکھ کر رومیلہ کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے اس نے دونوں کو بہت سمجھایا۔ لیکن یہ تو وہ جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ پھر اروشی نے اس کی بہت منت سماجت کی کہ بھیا سے کہہ کر دیکھیے تو۔ وہ ضرور ہمارا فیور لیں گے۔ آخر آپ لوگ بھی تو اس دشتِ پرخار کی خاک چھان چکے ہیں"۔ ڈرتے ڈرتے رومیلہ نے اشارتاً جواد کے سامنے ذکر کیا تو وہ آپے سے باہر ہوگیا "اس دو ٹکے کے آدمی کی یہ مجال۔ میں نے تم سے شادی کرلی تو تم کیا سمجھتی ہو۔ کسی خاندان سے بیٹی لے آنا اور بات ہے، بیٹی دینا اور بات۔ وہ اروشی کے لیے اس کے اسٹینڈرڈ کی ایک ساڑھی تو خریدنے کی پوزیشن میں ہے نہیں۔ اور خواب کیسے کیسے دیکھتا ہے۔ اب رومیلہ کیا بتاتی کہ یہ خواب صرف شامی کی آنکھوں نے نہیں دیکھے بلکہ اس کی تعبیر اروشی کی نگاہوں میں بھی جھلک رہی ہے۔ لیکن وہ بہن کو بھائی کی نظروں میں خوار کیسے کرتی۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر قفل ڈال لیے لیکن اروشی کو کچھ سن گن مل ہی گئی۔ لیکن کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہی پانی سر سے اونچا ہوگیا۔

وہ دونوں شہر کے ایک دور دراز ہوٹل میں گئے۔ یہاں ان کے کچھ دوست قاضی کے ساتھ موجود تھے۔ نکاح فوراً ہی ہوگیا۔ ارادہ تھا صبح بھائی بھاوج کی پناہ میں والدین کے پاس جائیں گے، قدموں پر جا گریں گے تو وہ معاف کر ہی دیں گے۔ آخر جواد بھائی کو معاف کر ہی دیا تھا نا! ۔ شب

وصل کی نسیم سبک روی سے گزر گئی تھی۔ شامی بے خبر سو رہا تھا، لیکن اروشی کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ کوئی نشتر سا کلیجے میں چبھا جا رہا تھا۔ صبح ہوتے ہوتے اس کی آنکھ لگ گئی تو ہاکر کے زور زور سے چلانے کی آواز پر آنکھ کھلی۔ "آج کی تازہ خبر ــــ سیٹھ ابراہیم کا بہیمانہ قتل۔ ڈاکہ زنی اور اغوا۔ کسی گھر کے بھیدی نے گیٹ کھول دیا تھا۔ ڈاکو گھس گئے۔ سارا قیمتی ساز و سامان لے گئے۔ سیٹھ ابراہیم نے مزاحمت کی تو بے دریغ گولیاں چلا دیں۔ وہ جائے واردات پر ہی ہلاک ہو گئے۔ ان کی بیٹی اروشی بھی لا پتہ ہے۔ قیاس ہے کہ اس کا بھی اغوا کیا گیا ہے۔ مزید تفصیلات کا انتظار ہے۔ آج کی تازہ خبر ــــ آج کی تازہ خبر ــــ ہاکر کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ اور اروشی کی آنکھوں کے سامنے زمین و آسمان گھوم گئے۔ سیٹھ ابراہیم کا قتل۔ ان کی بیٹی اروشی کا اغوا ــــ اس نے شامی کو جھنجھوڑ ڈالا۔" سنو۔ سنو۔ ہاکر کیا چیخ رہا ہے۔ پاپا کا قتل ہو گیا۔ کوٹھی میں ڈاکو گھس گئے"۔ اس کی آنکھیں خوفناک حد تک پھٹی ہوئی تھیں۔ ہائے یہ کیا ہو گیا۔ دروازہ تو میں نے کھلا چھوڑ دیا تھا کہ صبح ہونے کو ہے۔ ڈاکو گھات میں لگے ہوئے تھے۔ یہ کہاں پتہ تھا۔ ہائے۔ میں نے اپنے پاپا کو قتل کر دیا۔ وہ زمین پر سر پٹک رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنے ریشمی بال نوچ ڈالے۔ وہ روتے روتے بے حال ہو رہی تھی۔ شامی کے بھی اوسان گم تھے۔ حواس باختہ ہو رہا تھا۔ ایسا ہو گا، یہ تو انھوں نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا۔ انھوں نے تو آئندہ زندگی کے بڑے نرم و نازک حسین سپنے دیکھے تھے۔

سیٹھ ابراہیم کی کوٹھی میں قیامت برپا تھی۔ زبیدہ پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ سینہ پیٹ پیٹ کر خونا خون کر لیا تھا۔ اروشی اروشی چیختے چیختے آواز بیٹھ گئی تھی۔ سہاگ بھی اجڑا، اور کوکھ میں بھی آگ لگی۔ اپنی سونے جیسی بیٹی کا ایسا حشر انھوں نے خواب میں بھی کبھی نہیں سوچا تھا۔ وہ کہاں ہو گی۔ کس حال میں ہو گی یہ سوچنے کی تاب نہ تھی انھیں۔ روشنی اور جواد کا بھی حال ابتر تھا۔ فواد کو چپ کراتے کراتے روحیلہ خود بھی رونے لگتی۔ ڈاکو اروشی کو بھی لے گئے۔ یہ بات سوہان روح تھی ان سب کے لیے۔

میت آخری دیدار کے لیے باہر لان میں رکھی گئی۔ ایک ہجوم غفیر تھا کہ امڈا چلا آ رہا تھا۔ سیٹھ صاحب شہر کے معزز ترین لوگوں میں تھے اور بہت نیک نام تھے۔ ان کا ایسا دردناک انجام ــــ لوگ ایک نظر دیکھنے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے۔ ساتھ ہی شہر کی پولیس کو بھی گالیوں اور کوسنوں سے نوازا جا رہا تھا۔ کہ ڈاکو شتر بے مہار کی طرح شہر میں دندنا رہے تھے۔ اور وہ بے بس تھے۔ لوگ اس گھر کے بھیدی کو بھی برا بھلا کہہ رہے تھے۔ جس کی نمک حرامی نے یہ دن دکھایا۔ سچ ہے، فی زمانہ کسی پر بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔

زبیدہ آخری دیدار کے لیے گئیں۔ تو حال سے بے حال ہو گئیں۔ بے ہوش ہو کر گرنے لگیں۔ روشنی انھیں بانھوں سے تھام کے اندر لائی۔ یہ بڑی کوٹھی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ سب لوگ باہر تابوت کے گرد جمع تھے۔ روشنی ماں کو صحن میں بچھے تخت پر لٹا کر پلٹی ہی تھی کہ عقبی دروازہ دھڑاک سے کھلا اور اروشی تباہ حال، بین کرتی اندر گھسی۔ "ارے اروشی۔ تم۔ تمھیں تو ڈاکو لے گئے تھے۔ کیسے چھوٹیں ان ظالموں کے چنگل سے ــــ" روشنی کی حیرت اپنی انتہا کو چھو رہی تھی۔ پھر بھی اروشی کی آمد غم و اندوہ کے گھنیرے بادلوں میں ایک جگمگاتی کرن تو تھی ہی۔ وہ دوڑ کر اروشی سے لپٹ گئی۔ "روشنی، مجھے پاپا کا منہ دکھا دو، میں ان کا آخری دیدار تو کر لوں۔ مجھ بدنصیب کو محروم و نامراد نہ کرو"۔ اروشی بلک بلک کے رو رہی تھی۔

نکلو یہاں سے۔ دفعان ہوجانو۔ قبل اس کے کہ میری ماں کو تمھارے کالے کرتوت کا پتہ چلے۔ اس کے ہوش میں آنے سے پہلے نکل جانو یہاں سے۔ وہ تمھارے اس غم کو لے کر ساری عمر روتی رہے گی کہ تمہیں ڈاکو لے گئے۔ تم نے اس کی تربیت کو کالکو لگادی۔ ا سکے دودھ کو غلیظ گالی دی۔ وہ سہہ نہ سکے گی یہ غم۔ میں تمھارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ تمھارا اغوا ہم برداشت کرلیں گے لیکن تمھارا فرار وہ بھی ایسا خونیں فرار ہمیں کسی کو منہہ دکھانے کے قابل نہ رکھے گا۔ تمھارے بھائی، تمھارے ماں جائے۔ تمھاری بیوہ ماں کے سہارے شرم و غیرت سے خود کشی کرلیں گے

"ہاں۔ ہاں۔ چلو۔ ابھی تو میت باہر ہی ہے"۔ اس نے اروشی کا ہاتھ تھاما کہ پیچھے کھڑے ہوئے شامی پر نظر پڑ گئی۔ جو مجرموں کی طرح سر جھکائے ہوئے ہاتھوں میں سوٹ کیس لیے کھڑا تھا۔ چشم زدن میں ساری حقیقت روشنی پر روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی۔ نظر اٹھا کر دیکھا۔ تو اروشی کی مانگ میں چمکتی ہوئی افشاں پر نگاہ ٹھہر گئی۔ "اچھا ــــ !تو یہ بات ہے ــــ" اس نے نفرت کی سلگتی ہوئی ایسی نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھا کہ جھلس کے ہی رہ گئے دونوں۔ "تم ہو۔ وہ گھر کی بھیدی۔ جس نے آزان

گیٹ کھولا۔ ہم بھی حیران تھے کہ آخر وہ ہے کون۔ کہاں سمجھے تھے کہ اپنے خون نے دغا دی۔ تم نے ہماری عزت و آبرو کے ساتھ بھیانک مذاق ہی نہیں کیا بلکہ اس کو پاپا کے لہو سے گلنار بھی کر دیا۔ "تم" وہ انگلی اٹھا کر چیخی۔ "تم پاپا کی قاتل ہو۔ تم نے اپنی ماں کا سہاگ اجاڑا۔ ہم سب کو بے اماں کیا۔ ہمارا سائبان چھین لیا۔ نکل جاؤ یہاں سے۔ کبھی اپنا منحوس چہرا نہ دکھانا"۔ روشنی غصے سے بے قابو ہو کر چلائی "ارے تم نے ہمیں بے اماں ہی نہیں کیا، کنگال اور تہی داماں بھی کر دیا۔ ڈاکو گھر کی ایک ایک قیمتی چیز اٹھا کر لے گئے۔ ڈاکوؤں نے نہ صرف ہمارے موروثی زیورات لوٹے، بلکہ ممی کے سارے زیور اور وہ سارے زیورات جو ممی نے میرے لیے اور تمھارے لیے بنوا کر رکھے تھے وہ بھی لے گئے۔ فواد نے تو خود ہی اپنی سونے کی گھڑی اور چین اتار کر ظالموں کے حوالے کر دی۔ رومیلہ کی چوڑیاں اس بے دردی سے اتاریں کہ کلائیوں میں موچ آ گئی۔ یہی سب دیکھ کر تو پاپا بے قابو ہو گئے تو بے رحموں نے سینے میں گولیاں اتار دیں۔ اور ان ساری تباہی کی ذمہ دار تم ہو اروشی۔ تم۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے"۔ وہ چیخی "تم۔ پاپا کا منہ دیکھو گی۔ تھو"۔ اس نے زمین پر حقارت سے تھوک دیا۔ "جاؤ۔ تو کن آنکھوں سے دیکھو گی"۔ وہ استہزائیہ ہنسی۔ پھر خوفناک ہو کر چلائی۔" تم لوگ ابھی تک کھڑے ہوئے ہو۔ نکلو یہاں سے۔ دفعان ہو جاؤ۔ قبل اس کے کہ میری ماں کو تمھارے کالے کرتوت کا پتہ چلے۔ اس کے ہوش میں آنے سے پہلے نکل جاؤ یہاں سے۔ وہ تمھارے اس غم کو لے کر ساری عمر روتی رہے گی کہ تمھیں ڈاکو لے گئے۔ تم نے اس کی تربیت کو کالکھ لگا دی۔ اسکے دودھ کو غلیظ گالی دی۔ وہ سہہ نہ سکے گی یہ غم۔ میں تمھارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ تمھارا اغوا ہم برداشت کر لیں گے لیکن تمھارا فرار وہ بھی ایسا خونیں فرار ہمیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رکھے گا۔ تمھارے بھائی، تمھارے ماں جائے، تمھاری بیوہ ماں کے سہارے شرم و غیرت سے خودکشی کر لیں گے"۔ وہ زار زار رو رہی تھی۔ پھوٹ پھوٹ کے۔ تڑپ تڑپ کے۔

وہ ماتمی جلوس کے پیچھے چلتی رہی۔ کالی ردا میں خود کو چھپائے ہوئے۔ پاپا کی تدفین کی رسم شروع ہوئی اور وہ شفیق و مہربان چہرا منوں مٹی کے نیچے دبا دیا گیا۔ اب وہ کہاں دیکھ پائے گی انھیں۔ ہائے اسے تو آخری دیدار بھی نصیب نہیں ہوا۔ وہ ان کی سب سے لاڈلی بیٹی تھی۔ پاپا کتنا چاہتے تھے اسے۔ کہیں بھی جانا ہوتا اسے اپنے ساتھ لے جاتے۔ اس کی ہر سالگرہ پر اس کی توقع سے بڑھ کر تحفہ دیتے۔ ابھی پچھلی سالگرہ پر ہی تو ڈائمنڈ کا جگمگاتا ہوا لاکٹ دیا جو ابھی بھی اس کے گلے میں تھا۔ اس نے لاکٹ اٹھا کر اپنی خون برساتی ہوئی آنکھوں سے لگایا۔ طلائی زنجیر کو انگلیوں سے سہلانے لگی۔ تو چوڑیاں چھنک اٹھیں۔ ممی کو چوڑیاں کتنی پسند تھیں۔ اسے یاد آیا۔ رنگ برنگی چوڑیوں سے ان کی کلائیاں سجی رہتیں۔ پاپا کہتے زبیدہ تمھاری کلائیوں میں چوڑیاں کتنی زیب دیتی ہیں۔ اب وہ چوڑیاں کیسے پہنیں گی۔ اس نے تو ان کے سر سے سہاگ کی چادر نوچ ڈالی۔ بغیر چوڑیوں کے ان کی کلائیاں کیسی لگ رہی ہوں گی۔ یہ سوچنا بھی سوہان روح تھا۔ ڈاکوؤں نے جب بے دردی سے ممی کے ٹاپس کھینچے، ممی کے کان لہولہان ہو گئے تھے۔ روشنی کی آنسوؤں کو گلے میں گھونٹتی ہوئی آواز آئی۔ فواد نے کتنی بے بسی سے اپنی گھڑی ڈاکوؤں کے حوالے کی ہوگی۔ کتنی عزیز تھی اسے۔ جواد شیروں سی چھاتی والا اس کا ماں جایا۔ کتنی اذیت سے اس نے یہ سب کچھ برداشت کیا ہوگا۔ اور یہ سب قیامت اس کے منحوس ہاتھوں نے اپنے پیاروں پر ڈھائی تھی۔ اس کی آنکھوں سے لہو بہنے لگا۔

اب تک قبرستان خالی ہو چکا تھا۔ اداس شام کے سیاہ پوش سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ وہ درختوں کی اوٹ سے باہر نکل آئی اور بے تابی سے پاپا کی قبر پر گر پڑی۔ پاپا۔ میرے پاپا۔ بے آواز سسکیاں اس کا کلیجہ پھاڑے دے رہی تھیں۔ آپ کی گنہگار، شرمسار بیٹی آپ کے پاس آئی ہے۔ اسے معاف کر دیجیے۔ پاپا گلے سے لگا لیجیے۔ وہ بے تابی سے قبر کی مٹی اٹھا کر چہرے پر ملنے لگی۔ تڑپ تڑپ کے روتی رہی۔ اسے قبرستان سے بہت ڈر لگتا تھا اگر گزرنا پڑتا تو پاپا کے پہلو سے چمٹ جاتی۔ لیکن آج اسے بالکل ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ پاپا تو پاس ہیں ہی۔ ڈر کس بات کا وہ بڑی دیر تک قبر سے لپٹ کر روتی رہی۔ پاپا کو پکارتی رہی۔ پاپا اس کو کتنا چاہتے تھے۔ کوئی بات نہیں ٹالتے تھے۔ یہی مان تو تھا اس کا، کہ وہ پاپا کو منا ہی لے گی۔ جو اس نے اتنا سنگین قدم اٹھایا۔ پاپا معاف کر دیجیے۔ پاپا ایک بار محبت سے پکار لیجیے۔ پاپا۔ صرف ایک بار۔ وہ تڑپ تڑپ کے روتی رہی۔ قبر پر اپنی پیشانی ٹیکے — کہ شامی نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا "اٹھ جاؤ اروشی۔ رات ہو رہی ہے۔ پاپا کو چین سے سونے دو۔ اپنے آنسوؤں سے انھیں پریشان نہ کرو"۔ وہ کاندھوں سے تھام کر اسے باہر لایا۔ رومال سے چہرے اور بالوں کی مٹی صاف کی۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے بس اسے دیکھتی رہی۔ (یہ کتنا اجنبی اجنبی لگ رہا ہے)

رات کا پچھلا پہر ہوگا۔ اس نے اپنے قریب سوئے ہوئے شامی پر ایک الوداعی نظر ڈالی۔ اور سلیپنگ پلز کی شیشی کی ساری گولیاں اپنے حلق میں انڈیل لیں۔ جو وہ شام کو ہوٹل واپس آتے وقت خرید کر لائی تھی۔

اپنی زندگی کی آرزوئیں اور امنگیں تو وہ پاپا کے مزار پر ہی چھوڑ آئی تھی۔ ایک تن ریزہ ریزہ ہی تو بچا ہوا تھا۔ اسے گنوانے میں کیوں دیر کرتی !!●●●

صادقہ نواب سحر

شیشے کا دروازہ

''اسٹیشن روڈ کی گلی میں ایک ورائٹی اسٹور میں ایک لڑکی کے لیے جاب ہے۔'' میری سہیلی شبانہ نے مجھے بتایا'' وہاں لڑکیاں بھی کام کرتی ہیں۔''

جا کر دیکھا۔ یہ ایک بیس فٹ چوڑی اور ستر وفٹ لمبی دکان تھی۔ دائیں طرف دکان کی مالکن کا انگریزی کے 'ایل' کی شکل کا کانچ کا ٹیبل تھا۔ ٹیبل میں سے رنگ برنگی گھڑیاں جلوہ دکھا رہی تھیں۔ ٹیبل بہت خوبصورت اور قیمتی دکھائی دیا۔ اسی کے پیچھے آنٹی اپنی سرخ پالش والی ڈیزائنر کرسی پر براجمان ہوئیں۔ جب وہ وہاں بیٹھیں تو اپنے پیچھے چھت سے لگی ہوئی سبز پتوں اور بینگنی پھولوں کی بیلوں کے پس منظر میں ان کا چوڑا گورا چہرہ خوب پھبتا ہوا دکھائی دیا۔ سلیقے سے کٹے ہوئے بال بالکل خاموشی سے اے سی کی ٹھنڈ میں ان کی گردن پر کسی ڈرے سہمے بچے کی طرح پڑے ہوئے تھے۔ پھولوں کے گچھے کے پاس لگے ہوئے اسٹیریو سسٹم نے ان کے سیٹ پر بیٹھتے ہی ہلکی انگریزی موسیقی سے دکان کو یوں بھر دیا کہ الگ سماں بندھ گیا۔ اس ٹیبل سے کوئی دو فٹ کی دوری پر موٹے موٹے شیشوں کے شیلف پر کانچ، چینی مٹی، لکڑی، پلاسٹک کے خوبصورت شوپیس، گلدان، کافی مگ، گلاسیں اور کھلونے وغیرہ سجے ہوئے تھے۔ اس کے سامنے ایک لمبے سے شیشے کے ٹیبل میں بالوں کے پن، چوڑیاں، بڑی مالائیں، چھوٹی چھوٹی چیزوں میں جگمگا رہی تھیں۔ ٹیبل کی دوسری طرف دیوار سے نکلے ہوئے لمبے لمبے ہینگروں میں دوپٹے، اسکارف اور پرسیں لگی ہوئی تھیں۔ اسی کے نیچے دروازے تک کی پوری دیوار میں مختلف موقعوں کے گریٹنگ کارڈ کچھ دیوار کو ٹکائے ہوئے اور کچھ بچھائے ہوئے ہیں۔

ایک نازک لڑکی کی مورتی دروازے میں داخل ہوتے وقت سواگت کرتی نظر آئی تھی۔

مجھے وہاں کی لڑکیوں کا طور طریقہ اچھا لگا اور پھر وہاں آنے والے گاہکوں کو بھی دیکھا۔'' اچھے رنگ ڈھنگ کے ہیں اور اچھی انگریزی بولتے ہیں۔'' میں نے سوچا'' کچھ سیکھنے کو تو ملے گا۔ ہندی ذریعہ تعلیم سے پڑھائی کرنے کی وجہ سے میں انگریزی بولنے میں ذرا پیچھے رہ جاتی ہوں۔''

میں نے نوکری پالی۔ مجھے یہاں بچ بچ بہت سیکھنے کو ملا۔ اب مجھے سامان کی قیمت سمجھ میں آتی ہے۔ چھوٹ کتنی اور کس پر دی جاتی ہے؟ سب کچھ...اب مجھے اتنی عادت ہو گئی ہے کہ اپنی دکان کھولوں تو بھی پرابلم نہیں۔ آنٹی میرے بھروسے پر دکان چھوڑتی ہیں۔ انھیں بس کیش برابر چاہیے۔ ہر چیز لکھ کر رکھو۔ نہیں لکھا تو بھی پرابلم نہیں۔ حساب برابر سمجھتی ہیں۔ دکان میں روز کی کمائی کبھی ہزار روپے تو کبھی تین ہزار روپے ہوتی ہے۔ روزانہ تین ہزار روپے کا حساب ہوا تو بتانے کی ضرورت نہیں۔ اس سے کم ہوگا تو پوچھتی ہیں، آج اتنا کم کیسے ہوا؟''

''نئی پیڑھی کو کیا چاہئے؟'' مجھ سے پوچھ کر رجسٹر میں لکھتی ہیں۔

''فیشن روز بدل جاتا ہے، آنٹی'' میں کہتی ہوں۔

تم بھی تو کالج گرل ہو، تبھی تو تم سے پوچھتی ہوں۔'' وہ اپنی بائیں آنکھ پٹر پٹرا کر مذاق کے لہجے میں کہتی ہیں۔

اُس دن میں لنچ کھا کر ٹفن بند کر رہی تھی کہ اچانک گاہکوں سے شاپ بھر گئی۔ میں فوراً ڈبہ پیچھے رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ کوئی کارڈ دیکھ رہا تھا۔ کوئی لیڈیز پرس۔ میں خود دو لڑکیوں کو انگوٹھیاں اور کانوں کے بوندے دکھا رہی تھی لیکن میری نظر ہر گاہک پر تھی۔ اتنے میں مجھے لگا کہ شیلف میں ایک پرس کم دکھائی دے رہا ہے۔ میں نے فوراً آنکھوں ہی آنکھوں میں پرسوں کو گن لیا۔ ایک کم تھا۔

''مجھے یہ پرس چاہئے مگر پانچ سو روپے نہیں دے سکتی۔''

''ٹھیک ہے پچاس روپے کم دے دیجیے۔'' میں نے اطمینان کی سانس لی اور کہا۔ تبھی اس کے ساتھ کھڑی ہوئی لڑکی نے ٹیبل کے شیلف میں ہاتھ ڈال کر اس میں سے گھڑی نکال لی۔

''یہ بچتی نہیں ہے۔'' مجھے اس طرح اس کی ہوشیاری پر غصہ آیا تھا۔ اس لیے گھڑی اندر رکھ کر شیلف کو تالا لگا دیا۔ پرس خریدنے والی خاتون کا چہرہ عجیب سے ڈھنگ سے دیکھ کر وہ لڑکی اُس کے پیچھے چھپ گئی۔

''دو ہزار کا نوٹ؟'' میں نے پوچھا، ''آپ کے پاس ساڑھے چار سو روپے نہیں ہیں؟''

مخمل میں بنے پیسوں کے شیلف سے نوٹ نکالنے لگی۔ ساتھ والی لڑکی ٹی شرٹ دیکھنے لگی۔ مجھے سمجھ میں آنے لگا کہ ان دونوں کے معاملے الگ ہیں۔

''مجھے یاد آیا کہ پرس بک چکا ہے۔ ہماری دکان میں آپ کے لیے کچھ نہیں ہے میڈم!''، میں نے کہا، ''ساری!''

اگلے دن صبح سویرے شاپ پر پہنچ کر میں نے جھاڑن ہاتھ میں لیا۔ موپ سے فرش کو چمکایا اور مینیکوِن کے کپڑے بدل کر اس کے وگ کے بالوں کو برش کیا اور دوبارہ لگا دیا۔ آج ہفتے کا پہلا دن تھا۔ آج یہ کام بھی تھا۔

اچانک دو کنٹروں کو دیکھا۔ شیشے کا دروازہ کھول کر سیدھے ٹیبل کے سامنے کب آ کر کھڑے ہو گئے پتہ ہی نہیں چلا۔ میں ڈر چھپانے لگی۔

''ذرا انگوٹھی دکھانا بے بی۔'' کہا ایک نے لیکن دونوں کی گردن اور کمر لچک گئیں۔ میں نے شیلف سے چار انگوٹھیاں نکال کر ٹیبل پر رکھیں۔ وہ کچھ دیر انگوٹھیوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ دو انگوٹھیاں لوٹا دیں۔ پھر اپنی ساڑیاں لہراتے ہوئے چلے گئے۔ میں دیکھتی رہ گئی۔ ڈر کے مارے میری زبان ہی نہیں کھلی۔ مردوں جیسی قد کاٹھی کے شیو کئے ہوئے چہروں اور نقلی بالوں کے جوڑے باندھی ہوئی اس مخلوق سے پیسے مانگ نہ سکی۔ دونوں نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔

''کنٹر سے پیسے مانگوگی تو پاپ لگے گا۔'' ایک نے کہا۔ میری تو زبان ہی نہیں کھل رہی تھی میں کیا پیسے مانگتی! کپڑے اٹھا کر لے جاتے تو بھی کیا کرتی! شکر ہے یہ کپڑے ان کے کام کے نہیں تھے۔''

کچھ دیر بعد سنبھل کر میں نے اپنے آپ سے کہا، ''خدا کی مخلوق ہیں۔ ان سے ڈرنا کیوں!''

''ہیلو شبانہ! دو کنٹر ہمارے یہاں سے نکلے ہیں۔ دو انگوٹھی اٹھا لے گئے۔ سنبھلنا۔''

ہفتہ گزر گیا۔ ایک صبح پھولوں پر الیکٹرانک برش پھیر رہی تھی کہ ٹکوی دکان سے وہی دونوں نکلتے ہوئے دکھائی دیے۔ کندھوں پر رنگ برنگی ساڑی کو سیفٹی پن سے کسے ہوئے تھے۔ موٹی کمروں پر کسی ہوئی ناف بالکل بھلی نہیں لگ رہی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی میں نے برش کو آنٹی کی سیٹ پر پھینکا اور چابی لے کر شاپ سے باہر آ گئی۔ شیشے کا دروازہ لاک کر کے باہر آ کھڑی ہوئی۔ دونوں دکان پر آئے اور دروازے کو دھکیلنے لگے۔

''مالک ابھی آئے نہیں ہیں۔ آئیں گے تب ہی دروازہ کھلے گا۔''

دونوں نے بددعا کے انداز میں میری طرف جھٹک کر تالی پیٹتی اور گھورتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

ہمارا دکان کالج سے مشکل سے آٹھ دس منٹ کی پیدل دوری پر ہے۔ اسی لیے کالج کے اسٹوڈنٹ یہاں جمع ہوتے ہیں۔ ایک ہفتے سے دوسرے ہفتے فیشن کیسے بدل جاتا ہے، یہاں کام کرتے ہوئے پتہ چلا۔ نیل پالش، کبھی پلاسٹک پالش، جو کبھی دکھائی نہیں دیتی، کبھی بالکل سفید آئی لائنر۔ ہمارے یہاں ڈی او ڈورینٹ اور گریٹنگ کارڈ بھی ہوتے ہیں۔ ریک میں لگا ہوا سامان پچاس روپے سے شروع ہوتا ہے۔ ریک پر لکھے ہوئے الفاظ دل کو بہت بھاتے ہیں۔ میں نئی نئی کام پر لگی تھی۔ اس دن باقی لڑکیاں ابھی آئی نہیں تھیں۔ ایک شخص دکان میں آیا۔ اس کا برتاؤ الگ الگ سا لگ رہا تھا۔ مجھے لگا شاید پئے ہوئے تھا۔

''لیڈیز پرس ہے۔''

''نہیں ہے۔'' میں نے جھوٹ کہا کیوں کہ میں ڈر گئی تھی، چاہتی تھی کہ وہ یہاں سے فوراً چلا جائے۔

''نہیں ہے؟؟... کیسے نہیں ہے؟؟... کیوں نہیں ہے؟؟ آپ کے پاس اتنے آئٹم ہیں۔ پرس کیسے نہیں ہوگا؟'' وہ بھڑک کر بولا۔ میں ڈر گئی اور بولی، کہا نا نہیں ہے۔''

وہ آگے بڑھنے لگا۔

''جاؤ نہیں تو باہر کے لوگوں کو بلا لوں گی۔ یہ میرا نہیں، آنٹی کا شاپ ہے۔''

میری پرابلم انگلش زبان ہے اور یہ علاقہ چھوٹی بڑی اچھی اچھی دکانوں کا ہے۔ قریب ہی 'ناتھنیس' اور 'ہال مارک' جیسی دکانیں بھی ہیں۔ دن میں کام کرنے والی لڑکیاں میری دوست بن گئی ہیں۔ اس دکان میں تین لڑکیاں اور کام کرتی تھیں۔ دھیرے دھیرے سب چلی گئیں۔ ایک کو نکال دیا گیا کیوں کہ اس کے ہاتھ سے سامان گر کر ٹوٹتا رہتا تھا۔ دوسری کی شادی ہو گئی اور تیسری نے کالج میں آخری سال ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ یہ سب اتنی جلدی جلدی ہوا کہ جاب جوائن کرنے کے دس دنوں کے اندر ہی میں اکیلی سیلز گرل رہ گئی۔ شروع شروع میں آنٹی یا ان کی بہو میرے ساتھ ہوتیں، لیکن آنٹی کے بیٹے کا ٹرانسفر ہو گیا اور آنٹی کا مجھ پر بھروسہ بڑھ گیا۔ اب میں یہاں اکیلی ہی ہوتی ہوں۔

اگلے دن ایک کسٹمر ادھر اُدھر انگلش میں شروع ہو گیا۔ دو منٹ بعد سمجھ میں آیا کہ وہ نا پکنگ جیسی کسی نام کی چیز مانگ رہا ہے۔

''وڈ یو ہیو اٹ؟''

''نو سر۔ ساری'' میں نے فوراً منع کر دیا۔

رات آٹھ بجے کے قریب آنٹی حساب دیکھنے آتی ہیں۔ اس دن میں نے آنٹی سے پوچھا تو وہ بولیں، ''اندر جا کر دیکھو۔''

''اتنا مہنگا سو روپے سے شروع ہونے والا آئٹم تھا۔ اتنی صبح صبح گراہک چھوڑ دیا۔''

''غلطی ہو گئی۔''

وہ سیدھے ہندی میں کہتا تو نائی وہن دے نہ دیتی۔ اگر اس نے آدھا ہندی اور آدھا انگلش میں بولا ہوتا تب بھی سمجھ میں آتا۔ پورا انگلش میں بولا اور اتنی تیزی سے تو مشکل ہے سمجھنا۔ ''ہی''، ''شی'' کے علاوہ کچھ پلے نہیں پڑا۔

''آج کل چھوٹے بچے انگلش بہت زیادہ بولتے ہیں۔ جس کو دیکھو وہ انگریزی میڈیم کے اسکولوں میں بچوں کو ڈالنا زیادہ ضروری سمجھتا ہے۔ پیٹ کاٹ کاٹ کر ٹیوشن کی فیس ادا کرتے ہیں۔''... میری زبان تک بات آئی مگر میں کچھ بولی نہیں۔ یہاں آنٹی کو چاہیے صرف کیش۔ وہ ٹھیک سمجھ رہی ہیں، اس لئے میں یہاں ہوں۔

''کسٹمر کو تم کیسے ہینڈل کرتی ہو، وہ تمہارا کام ہے۔''

جس دن مال آتا ہے، رجسٹر پر لکھ کر رکھ دیتی ہوں کہ اتنا اتنا مال آیا۔ اتنا ڈسپلے ؟؟؟ کیا۔ ایک چیز بکی، ایک طرف لکھا۔ قیمت لکھی ہوئی ہو تو شام کو حساب مل ہی جاتا ہے۔

اُس شام آٹھ بجے کلوزنگ کے وقت گاہک کے ہاتھ سے شیشے کا گلدان چھوٹا اور چھن...ن...ن... سے ٹوٹ گیا۔ قیمت ڈیڑھ سو روپے تھی۔ گراہک سے آدھے پیسے لینے پڑے۔ پہلے ہم مشہور ہورائزن کمپنی کی برانڈیڈ چیزیں رکھتے تھے لیکن اب اُن برانڈ والوں کی آپس کی پھوٹ کی وجہ سے اُن کی فیکٹری بند ہو گئی۔ پھر بھی ابھی ''ہورائزن' کمپنی کا نام ہماری شاپ سے نہیں ہٹایا ہے۔ اُن سے کہہ کر اب ہم نے اور جگہوں سے سامان منگوانا شروع کر لیا ہے۔ دام سے ہی پتہ چلتا ہے کہ چیز برانڈیڈ نہیں ہے۔ پوچھنے پر میں گاہک کو بتا بھی دیتی ہوں۔ ویسے بھی سستی ہونے پر وہ خود بھی سمجھ جاتے ہیں۔

اُس دن آنٹی شام پانچ بجے ہی شاپ پر آ گئیں۔ اُن کی سیٹ پر میں کبھی نہیں بیٹھتی۔ اُس دن بھی ان کی کرسی کے پاس پڑے اسٹول پر میں اپنی سہیلی شہناز کے ساتھ بیٹھی گپیں لڑا رہی تھی۔ آنٹی کو دیکھ کر میں اٹھی۔ تبھی ایک گاہک دکان میں آیا۔ میں اٹھ کر اُس کی مدد کرنے لگی۔

آنٹی نے روزانہ کی طرح سیٹ پر بیٹھتے ہی دکان میں ادھر اُدھر نہیں دیکھا۔ سامنے گلی کے نکڑ سے آگے تک کا منظر اُن کی آنکھوں کے سامنے کھلا تھا۔ چھترپتی شیواجی ٹرمنس سے آنے والی ٹرین اسٹیشن پر دھیرے دھیرے رُک رہی تھی۔ جنرل ڈبے کے کچھ درمیانہ عمر کے مرد، کالج کے کچھ منچلے لڑکے کمپارٹمنٹ سے کود کر پلیٹ فارم پر کچھ قدم ٹرین کے ساتھ دوڑ رہے تھے۔ ابھی کچھ منٹوں میں شہر کو جانے والا یہ راستہ بھیڑ سے اَٹ جائے گا۔ آنٹی راستے کو گھورتی رہیں۔

آنٹی کے آنے کے کچھ دیر بعد شہناز اپنی دکان میں لوٹ گئی۔

''دوستوں کا جمگھٹ یہاں پندرہ منٹ سے زیادہ دکھائی دیا تو...''

اُس کے جانے کے بعد آنٹی نے مجھ سے کہا۔ کہا کیا، کہتے کہتے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''تیری خیر نہیں۔'' میں نے دل ہی دل میں ان کا جملہ پورا کر دیا۔

''کالج پاس ہی ہے اسی لئے سہیلیاں آ جاتی ہیں...اور پھر شہناز نے ہی تو نوکری لگائی تھی۔''

''چلو جاب چھوڑ دو۔''

میں ہکا بکا رہ گئی۔ ذرا سی بات پر کیسے یہ کہہ گئیں!

''تمہارا اپنا گھر نہیں ہے کہ اپنے دوستوں کو بٹھاؤ، خاطرداری کرو۔ خاص کر لڑکا تو بالکل نہیں چاہئے۔ دوستوں کے بارے میں تو میں سوچ بھی سکتی ہوں، لیکن دوست ہوں یا باہر والے، آدھا گھنٹہ رُکے تو کچھ نہ کچھ لے جائے ورنہ ٹائم پاس کرنے کا نہیں۔ کوئی دس منٹ ٹھہرے تو فوراً پوچھنا چاہئے، 'آپ کو کیا چاہئے؟' کچھ اور وقت گزارے تو غصے سے پوچھو، اس سے زیادہ وقت رُکے تو آرام سے کہو، 'چلے جایئے'۔''

''ٹرین کا معاملہ ہے۔ سامنے ہی اسٹیشن پر ٹرین کے وقت پر بھیڑ رہتی ہے۔ بارش ہونے لگے تو لوگ دکان میں چلے آتے ہیں اور کارڈ دیکھنے لگتے ہیں۔ دو کارڈ دیکھے تو دس منٹ گزر گئے۔'' مگر میری یہ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔

''ٹھیک ہے آنٹی۔'' بس یہی کہہ پائی۔

اُس دن وہ لڑکی یہی کر رہی تھی۔ فون پر لگاتار بات بھی کرتی جا رہی تھی۔ کافی دیر بعد میں نے پوچھا، کیا چاہئے؟''

''لورس کارڈ چاہئے۔''

''دیکھ رہی ہوں، کافی دیر دیکھتی رہی ہو۔ ایک گھنٹہ پورا ہونے لگا

ہے۔''

''میں 'ہورائزن' میں ہوں۔ اِدھر آ جاؤ۔'' وہ مجھے اَن سُنا کر کے فون پر کسی سے کہہ رہی تھی۔

''آپ جا سکتی ہیں۔''

''کارڈ دیکھ رہی ہوں۔''

''یہ نہیں چلتا۔ فون بند کرو۔''

''لے رہی ہوں نا!''

''مجھے ڈیزنگ چاہیے۔''

جب نئی نئی لگی تھی، تب کوئی گرا ہک دو گھنٹے بھی لگاتا تھا تب بھی بول نہیں پاتی تھی۔

اگر تم اپنا سامنا نہیں کر سکتیں تو دوسروں کا بھی نہیں کر سکتیں۔''

آنٹی نے مجھے سکھایا کہ آدمی کیسے ہوتے ہیں۔ لوگوں کا تجربہ باہر آ کر سمجھ میں آیا ورنہ کالج سے گھر، گھر سے کالج اسی کے بیچ دنیا کی سمجھ تھی۔ نئی پیڑھی کی ہو کر بھی پتہ نہیں تھا۔ کہیں اور کام کرتی تو شاید پتہ چلتا بھی نہیں۔ کبھی کبھی لگتا ہے کہ دنیا بڑی بیکاری ہے۔ نئی نسل بھی... بات کا ڈھنگ ہی نرالا ہے۔ اس سال میں نے بی۔ اے کے آخری سال میں ایڈمیشن لیا ہے۔ خریداروں کو دیکھ کر سوچتی ہوں کہ میں پرانی نسل کی ہو گئی ہوں۔ غریب اور حیثیت والوں کے طور طریقے میں فرق محسوس کرتی ہوں۔ اونچی حیثیت والے عزت دے کر۔

''ویدی یہ دو۔''

''وہ دو۔''

''اس کی پرائز کیا ہے۔؟'' کہہ کر باتیں کرتے ہیں۔ غریب کو لگتا ہے نوکر ہے۔

''یہ دے دے چل۔''

''جلدی دے بابا! کیا کرتی ہے رے؟''

''اس طرح بات کرتے ہیں؟ گراہک ہو تو دکان میں کام کرنے والوں سے عزت سے بات نہیں کر سکتے!''

''ارے ایسے کیوں بات کرتا ہے؟ غریب لڑکی ہے۔'' اس کا ساتھی اس سے کہتا ہے۔

''غریب کو مستی بہت ہوتی ہے۔'' وہ بھی میری طرف دیکھتے ہوئے دوست کو جواب دیتا ہے۔

''میں بھی جانتی ہوں، سہنا پڑتا ہے۔ ایک بار تو میں رو ہی پڑی۔ ایک گراہک نے بڑے بُرے ڈھنگ سے مجھ سے ٹائی کی قیمت پوچھی۔

میں کو دُو دیکھنے لگی۔

''اوئے! اکڑے مُجھ تیا چی پرائز!(ارے یہاں دیکھ اس کی قیمت)''

''ذرا عزت سے بات کرو نا!''

''تو مالکن ہے یا نوکر ہے؟''

''میں نوکر ہوں مگر آپ کا کام کرتی ہوں۔ مجھ سے تمیز سے بات کیجیے۔''

''کام کرتی ہے تو عزت سے رہ۔ دوسروں کا کھاتی ہے۔ گھمنڈ کرتی ہے۔''

''محنت کرتی ہوں تو ملتا ہے۔''

''تو ہم کہاں بیٹھ کر کھاتے ہیں؟''

''یہاں بیٹھی ہے تو اپنی عزت کیوں خراب کر رہی ہے؟''

''میں تو نوکر ہوں۔ سب کو بتاتی ہوں۔ میں آپ سے آپ کہہ کر بات کرتی ہوں نا! آپ کا عزت سے بات کرنا بھی ضروری ہے۔''

''نوکر ہے تو!'' اس نے دایاں ہاتھ اُٹھا کر کہا، ''تیری عزت تیرے پاس رکھ۔'' اس کے نتھنے پھول رہے تھے۔

''صحیح طریقے سے بات نہیں کرنی، چلے جاؤ۔''

اس دن میں بہت روئی۔

میرے غصے سے آنٹی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

''آنٹی میں جاب چھوڑ رہی ہوں۔'' شام کو میں نے آنٹی سے کہا، آپ کے کسٹمر بُرے طریقے سے بات کرتے ہیں۔'' میں نے انھیں سب بتایا۔

''اتنی ٹُھنکار کرنی ہی نہیں چاہیے۔ سامنے والے کو شہہ ملتی ہے۔ جواب پر جواب دے کر اس کو چھیڑنے کا مزا دیتی ہو تم!'' آنٹی نے اپنی چھوٹی چھوٹی گڑھوالی آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑ دیں۔ اُن کا گورا چہرہ سُرخ ہو گیا، ''میں نے سی سی ٹی وی سے سب دیکھا تھا۔''

''آئی ایم ساری آنٹی۔'' میں نے اپنی پلکیں دھیرے سے جھکا لیں۔ وہ ایک لمحہ میں شانت ہو گئیں۔

''کوئی بھی کسٹمر غلط سلط بولا تو کہہ دینا، 'یہ میرا شاپ ہے، میں شاپ کیپر ہوں۔ کسی دوسرے کو یہاں بیٹھے دیکھا ہے کیا؟... نہیں نا!... یہ شاپ میرا ہے۔ میری عزت کیسی ہے، کیا ہے... مجھے پتہ ہے۔ پولیس کمپلینٹ کروں گی...'' آنٹی نے مجھے ہمت دی۔

''تو تو کہتی ہے، تیرا چچا حوالدار ہے۔ کھنڈالا کے گھاٹ پر اس کی

ڈیوٹی لگی ہے۔ وہ کتنی دوری پر ہے؟ اور... پھر تُو روئے گی تو وہ بولتا جائے گا۔ سمجھ جائے گا کہ تُو کمزور ہے۔ رونا ہو تو بعد میں رو۔ کسی نے غلط بولا، جواب دو۔" پھر اچانک وہ بھڑک اٹھتی ہیں،" خلاصہ یہ کہ کسٹمر کو ٹھیک سے اٹینڈ کرنا ضروری ہے۔ سمجھیں! یہ نہیں ہوتا تو فوراً جاب چھوڑ دو، میرے منہ پر چابی مار دو۔"

مجھے لگتا ہے سب باس پر منحصر ہوتا ہے۔ وہ وشواس دلائے تو ڈانٹے ہی کیوں نہ!

پچھلے سال بی اے کے سال دوم کی چھٹیوں میں تین مہینوں کے لیے میں نے نوکری کر لی تھی اور آنٹی کو بھی میری ضرورت ہے۔ جس دن انھوں نے دکان کی چابی دی تھی... تب سے وہ وہاں نہیں بیٹھیں۔ اب تو میں کوڈ دیکھے بغیر چیزوں کی قیمت جانتی ہوں۔ شروع میں تو آنٹی بیمار تھیں، ایک ہفتے بعد شاپ پر آئیں۔ پتہ چلا، یہ لڑکی اچھی طرح کام کرتی ہے۔ پہلے دن ہی میں نے انھیں ساڑھے تین ہزار روپے کیش جو دیے تھے۔ بس ان کا وشواس بن گیا۔ جب مجھے جاب پر رکھا تب سے وہ مجھے اچھی لگتی ہیں۔ بڑے پیار سے پوچھا،" کہاں رہتی ہو؟ کیا کرتی ہو؟ جاب کی ضرورت کیوں ہے؟"

میں نے ان سے کہا تھا،" چھٹیاں ہیں۔ بس اسی لئے تجربے کے لئے کام کرنا چاہتی ہوں۔"

لیکن سچ تو یہ ہے کہ ڈیڈی میری طرف دھیان نہیں دیتے،" بارہویں ہوئی نا! اب تمہاری شادی کرتے ہیں۔ ہم خاندیش سے ہیں۔ ہمارے یہاں لڑکی اٹھارہ کی ہوئی تو بہت بڑی ہوئی۔" وہ کہتے ہیں۔

"ابھی نہیں گریجویشن ہو جانے دو بابا۔"

"میں پیسے ہی نہیں دوں گا۔" وہ مجھے فیس نہ دینے کی دھمکی دیتے ہیں۔

"جاب کروں گی۔ خود کما کر پڑھوں گی۔"

"ایک روپیہ بھی نہیں ملے گا۔ آج سے خرچہ بھی بند!" وہ سختی سے کہتے ہیں۔

یہ سب میں نے آنٹی کو نہیں بتایا۔ ورنہ وہ اسے مجبوری سمجھتیں۔ شاید من دکھا کر بات کرتیں۔ آج انھیں لگتا ہے، میں ایسے ہی ہاتھ خرچ کے لیے کام کرتی ہوں۔ اب وہ مجھے بیٹی ماننے لگی ہیں۔ گھر کے پروگرام میں بھی بلاتی ہیں۔ گھر میں کام نہیں کرواتیں۔ ان کی بیٹی سونیا بڑی سخت ہے۔ جب یہاں آتی ہے تو دکان اوپر سے نیچے تک دیکھتی ہے۔ کام کرنے والوں سے اُسے کچھ لینا دینا نہیں۔ صرف دکان سے مطلب ہے۔ ٹیبل کی کانچ پر انگلی پھیر کر دھول کا دھبہ دکھاتی ہے۔

گراہک نہیں دیکھتی۔ سیدھے کہتی ہے،

"دیکھو بیٹا اپرنا! یہ اچھی طرح صاف کرنا چاہیے۔ تمھیں کیسا لگتا ہے؟ کسٹمر آئے تو اچھی بات ہوگی؟ وہ سمجھے گا پُرانی چیز ہے۔" فٹ سے بولتی ہے۔

فون کرتی ہے تب بھی مجھ سے یہی پوچھتی ہے۔ آنٹی یہ سب دیکھتی ہیں اور چپ چاپ مسکراتی رہتی ہیں۔ منع نہیں کرتیں۔ انھوں نے مجھے بتایا تھا،" بے بی کے نام سے ہی اس شاپ کی پرمیشن ملی ہے۔ اُس نے ہوٹل مینجمنٹ کا کورس کیا ہے۔ اسی نے اپنے ماں باپ کو آئیڈیا دیا تھا۔

"تمہارے انکل نہیں آتے کبھی شاپ پر۔ ریٹائرڈ ہیں مگر انھیں دکان میں کوئی دلچسپی نہیں۔"

"آپ لوگ ہماچل پردیش اپنے گاؤں بھی نہیں جاتے؟"

"فرصت ہی نہیں ملتی۔"

"گاؤں کو ہم نے یادوں میں ضرور بسا لیا ہے۔ اور پھر جائیں تو رہیں کہاں؟ ہمارے ماں باپ نہیں رہے۔ دور کے رشتے دار بس دور ہی ہیں۔" آنٹی ٹھنڈی سانس بھر کر کہتی ہیں۔

اس جاب نے مجھے فیس کے پیسے ہی نہیں دیے، میری زندگی بھی بدل دی ہے۔ قبرستان کے پیچھے جھونپڑپٹی میں رہنے والی لڑکی، جو کسی سے بات بھی نہیں کر سکتی تھی، سمجھ گئی۔

"یا تو فٹ سے جواب دو یا پھر چلی جاؤ۔"

حساب کا بہی کھاتہ بند کر کے میں نے آنٹی کے ٹیبل کے دائیں طرف بنی دراز میں رکھ دیا۔ آئینے کے سامنے کھڑے رہ کر کھلے بالوں میں چِن لگایا۔ اپنے سفید دوپٹے کو چہرے کے گرد لپیٹ کر پل بھر خود کو غور سے دیکھا۔ پرانی کالی جینس پینٹ پر پہنے سفید لمبے کُرتے کی سلوٹوں کو درست کیا۔ پرس، تالا اور چابی کا گچھا اٹھا کر شیشے کا دروازہ کھول کر دوکان سے باہر نکل آئی۔ دکان کا آدھے کھلے شٹر کو گرا کر اُسے لاک کیا۔ شبانہ اپنی دوکان کو لاک کر کے میرے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھی۔

"اِتنی خوبصورت دوکان میں، میں سانولی، گول چہرے پر مہاسوں کے داغوں والی، معمولی سی سُوتی یا سستے سلتھے ٹیک کپڑوں میں غریب ضرور دکھائی دیتی ہوں، کم حیثیت والی، مگر کوئی مجھ سے جیت کر تو دکھا دے!" ذرا سا گردن اونچی کیے ہوئے سڑک پر اپنے بڑھتے قدموں پر نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔

"تم نے مجھ سے کچھ کہا؟" شبانہ نے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے مسکرا کر اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

شفیقہ فرحت

ایک باپ کی بھٹکتی روح

''اماں کوئی ہے!''

''کہاں — ؟''

''یہاں — اس کمرے میں''

نہیں بیٹا کوئی نہیں۔''

''نہیں اماں۔ کوئی ہے۔ سفید کپڑے پہنے۔ صورت صاف نہیں دکھ رہی۔ مگر ہے کوئی۔ اماں۔ بڑی دیر سے میرے آگے پیچھے پھر رہا ہے —''

''میں بھی تو گھنٹہ بھر سے یہیں ہوں مجھے تو کوئی نہیں دکھا۔ باہر کا دروازہ بند ہے۔ کوئی آ ہی نہیں سکتا۔''

مگر مجھے تو لگ رہا ہے جیسے کوئی چل پھر رہا ہے۔''

اچھا میں برآمدے میں دیکھتا ہوں۔''

''نہیں اماں۔ تم مت جاؤ۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔

''اتنی بڑی لڑکی خواہ مخواہ ڈر رہی ہے'' ماں کے دل میں بھی خوف کی لہر دوڑ گئی۔ شاید دل کا چور ہو۔

''ارے سن تیرا فیورٹ سانگ آ رہا ہے۔''

''مجھے تو قوالی جیسا لگ رہا ہے''

''قوالی — George Michael کا کیسٹ ہے۔''

''تو اماں اس میں قوالی کی دُھن کیسے آ گئی — ؟''

''قوالی کہاں — غور سے سن''

''اماں۔ اب تو اگر بتی کی خوشبو بھی آ رہی ہے۔ اور

''اماں وہ پھر کھڑکی سے جھانک رہا ہے''

''کھڑکی سے — ؟ کھڑکی بند ہے۔ اس پر موٹا پردہ پڑا ہے تجھے کیسے دکھائی دیا۔''

''کون ہے — ؟ کون ہے — ؟''

بیٹا کوئی نہیں۔ تیرا وہم ہے۔ Horror movies بہت دیکھتی ہے نا۔''

''بیٹا وہم نہیں۔ یہ میں ہوں۔ سفید کپڑے میں لپٹی تیرے باپ کی روح جو اکیس برس سے بھٹک رہی ہے۔ آج کے دن۔ بلکہ آج کی شام ساڑھے چھ بجے جب میں نے دنیا چھوڑی تھی اور تو صرف گیارہ مہینے دو دن کی ننھی منّی پیاری بچی تھی اُس دن سے اُس شام سے بھٹک رہی ہے''

''بیٹا وہم نہیں۔ یہ میں ہوں۔ سفید کپڑے میں لپٹی تیرے باپ کی روح جو اکیس برس سے بھٹک رہی ہے۔ آج کے دن۔ بلکہ آج کی شام ساڑھے چھ بجے جب میں نے دنیا چھوڑی تھی اور تو صرف گیارہ مہینے دو دن کی ننھی منی پیاری بچی تھی اس دن سے اس شام سے بھٹک رہی ہے۔ ہر سال اس تاریخ کو اس وقت تیرے ارد گرد منڈلاتی رہتی ہے اور منڈلاتی رہے گی جب تک تجھے اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ تیرا بدنصیب، نامراد، ناکام باپ اتنا برا آدمی نہیں تھا جتنا تجھے بتایا گیا ہے —

قبر کی زمین تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ مٹی سوکھتی جا رہی ہے، سوکھ سوکھ کر پتھر سے بھی سخت ہو گئی ہے۔

میں اچھا انسان نہیں تھا۔ تھوڑا سا بے ایمان تھا۔ تھوڑا سا دھوکے

باز۔ دنیا دار۔ لیکن میں ایسا اس لیے تھا کہ میں دنیا میں کچھ بننا چاہتا تھا۔ مگر کچھ بننے کے لیے میرے پاس کچھ نہ تھا۔ صرف اچھی صورت، دلچسپ باتیں اور ہنسنے ہنسانے والے لطیفے۔ ویسے تو یہ ترقی کے پنکھ ہیں۔ مگر پنکھ پھیلانے کے لیے تھوڑی سی جگہ تو چاہیے۔ پیر رکھنے کے لیے تھوڑی سی زمین تو چاہیے۔ ایروڈروم نہ سہی ٹیلی پیڈ ہی سہی۔ کچرے کے ڈھیر سے تو اڑا نہیں جا سکتا۔ اس میں تو پیر جو اندر کی طرف دھنستے ہیں تو دھنستے ہی چلے جاتے ہیں۔ نیچے ہی نیچے۔ مٹی میں گچر میں کیچڑ میں۔ اندر ہی اندر۔ جیسے میں دھنس گیا۔ آسمانوں پہ اڑنے کی کوشش میں قبر کی مٹی نے اپنی طرف کھینچ لیا۔

بیٹی زندگی اگر مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دیتی تو میں وہ بنتا وہاں پہنچتا جہاں پہنچنے کے لیے میں نے تیری ماں کا سہارا لیا تھا۔ اور ایسی خوبصورت آرام دہ زندگی دیتا، وہ ساری آسائشیں دیتا جو آج تجھے تیری ماں اکیلی دے رہی ہے۔ ان سب کو پکڑنے کے لیے میں نے تیزی سے بھاگنا شروع کیا۔ کچھ شارٹ کٹس اختیار کیے۔ میں جھوٹی شان دکھانے لگا۔ دوسروں پر بلا وجہ پیسہ خرچ کرنے لگا۔ اس جھوٹی شان کی خاطر مجھے تیری ماں کے ساتھ کچھ چھوٹی موٹی بے ایمانیاں کرنی پڑیں۔ بہانے بازی، دھوکے بازی کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔

مگر بیٹی یہ سب کھل جاتا ہے اور جب سچ سامنے آتا ہے تو آدمی کہیں کا نہیں رہتا۔ اپنوں کی نظروں میں اس کے لیے ذلت کا پیلا کالا رنگ بھر جائے تو پھر زندگی کیا اور زندگی کی بلندیاں کیا۔ مجھے مہلت نہیں ملی کہ میں تیری ماں اور اس کے خاندان والوں کی آنکھوں سے یہ رنگ اڑا دیتا۔

اب تیری آنکھوں میں بھی اسی رنگ کا عکس ہے۔ تو اپنے باپ کا نام سننا ہی نہیں چاہتی کہ کوئی تیرے آگے تیرے باپ کا نام لیتا ہی نہیں چاہتا۔ سب نے اس ورق کو ایسی گوند سے چپکا دیا ہے کہ آج اکیس برس ہو گئے وہ ورق کھلا نہیں۔ کہیں سے بھی نہیں ذرا سا بھی نہیں۔

بیٹی میں تجھے بہت چاہتا تھا۔ اب بھی چاہتا ہوں۔ شاید اسی لیے میری روح کو آج تک قرار نہیں آیا۔ تیرے لیے میری محبت میرا پیار دیوانگی کی حد تک تھا۔ مگر سب نے اس پیار کو بھی دکھاوا سمجھا۔ تجھ سے پہلے ہم اپنا ایک بیٹا کھو چکے تھے۔ پیدائش کے چوتھے ہی دن وہ چپکے سے بغیر ہچکی لیے چل بسا۔ پیدا ہونے کے بعد شاید اس نے ایک بار بھی آنکھیں کھول کر اپنی ماں اور اپنے باپ کو نہیں دیکھا۔ پیدا ہونے پر ایک بار رویا ضرور لیکن معصوم مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ نہیں آنے پائی اور اس کی سانس اکھڑنے لگی تو اسے ماں کے پہلو سے اور باپ کی نظروں سے الگ

کر کے انکیوبیٹر میں رکھ دیا گیا۔ اس کا رنگ سفید تھا۔ وہ نیلا پڑ گیا اور اسی انکیوبیٹر میں لیٹے لیٹے بغیر ہاتھ پیر چلائے، بغیر کلکاریاں مارے سفید بادلوں پہ سوار نیلے آسمان پر اڑ گیا۔ ہم خالی ہاتھ سونی گود گھر آ گئے۔

جب تم پیدا ہونے والی تھیں ہم شروع ہی سے محتاط ہو گئے۔ ہر پندرھویں دن باقاعدہ چیک اپ ہوتا۔ مہنگے مہنگے انجکشن لگتے۔ کتنی دعائیں مانگیں، کتنی منتیں مانیں تب جا کر تم خیر و عافیت سے دنیا میں آئیں۔ جب تم نے پہلی بار اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کھولیں اور پندی پندی نظروں سے اپنی ماں اور اپنے باپ کو دیکھا اور تمہارے پتلے پتلے ہونٹوں اور نظر نہ آنے والے دہانے پر پہلی مسکراہٹ آئی۔ مانو ہمیں دنیا جہاں کی دولت مل گئی۔

تمہارے بھائی کے لیے تمہاری دادی اور پھوپی نے بہت پہلے

> ”بیٹی زندگی اگر مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دیتی تو میں وہ بنتا وہاں پہنچتا جہاں پہنچنے کے لیے میں نے تیری ماں کا سہارا لیا تھا۔ اور ایسی خوبصورت آرام دہ زندگی دیتا، وہ ساری آسائشیں دیتا جو آج تجھے تیری ماں اکیلی دے رہی ہے۔ ان سب کو پکڑنے کے لیے میں نے تیزی سے بھاگنا شروع کیا کچھ شارٹ کٹس اختیار کیے۔ میں جھوٹی شان دکھانے لگا۔ دوسروں پر بلا وجہ پیسہ خرچ کرنے لگا۔ اس جھوٹی شان کی خاطر مجھے تیری ماں کے ساتھ کچھ چھوٹی موٹی بے ایمانیاں کرنی پڑیں“

سے بہت اہتمام کیے تھے۔ نئے نئے ڈھیروں جھبلے، درجنوں نہالچے ریشمی دلائیاں۔ ننھے ننھے تکیے۔ گرم کپڑے۔ سوٹ کیس بھر گیا تھا۔ بھائی ایک نہ پہن سکا۔ بعد میں سوٹ کیس کھولتے ہی تمہاری ماں ایسے پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ اس مرتبہ کسی نے مارے انجانے خوف کے ایک نئی دھجی نہ سی۔ دادا دادی اور نانا نانی کے پرانے کرتوں کے دو چار جھبلے اور بس۔

پہلا نیا کپڑا شاید چھٹی کے دن بھی نہیں پہنایا گیا تھا۔ اس کے لیے ہم سب دم سادھے چھلّے کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر تو نئے کپڑوں سے تمہارا کمرہ بھر گیا کہ تم ہماری آنکھوں کا نور دل کا سرور تھیں۔

میری آنکھوں کے نور سے تمہاری آنکھوں میں بھی دیے سے

جھلانے لگتے اور تم ٹکر ٹکر میری طرف دیکھتیں، مسکراتیں۔ خوشی میں ننھے ننھے ہاتھ پاؤں زور زور سے چلاتیں اور میں اپنی ساری محرومیاں اور پریشانیاں بھول کر تمہیں سینے سے لگا لیتا۔ جیسے ہی تمہاری گردن ذرا مضبوط ہوئی میں نے تمہیں گھمانا پھرانا شروع کیا۔ سردیوں کی نرم دھوپ میں نہلا دھلا کر اچھے اچھے خوش رنگ کپڑے پہنا کر، بازوؤں میں بھر کے سینے سے چپکائے سارے محلے میں تمہیں گھماتا رہتا اور تم بھی بڑے اطمینان اور پیار سے چپکی رہتیں۔ سارا محلہ تمہیں پہچاننے لگا تھا اور جو ملتا اس ننھے راہی کو پیار کرتا۔ تمہاری اماں بہت ناراض ہوتیں کہ جگہ جگہ لے جانے سے کہیں تمہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے۔

ویسے بھی تمہاری عادتیں خراب ہو رہی تھیں۔ پلنگ اور جھولے میں تم ایک منٹ لیٹنا نہ چاہتی تھیں بس گود میں چڑھ کر ٹہلنا پسند تھا، شاید باپ کی گود تھوڑے دن میں چھننے والی جو تھی۔

''قبر کی سخت مٹی میں میری ھڈیاں چٹخ رھی ھیں۔ ریزہ ریزہ ھورھی ھیں۔ میری ٹوٹی پھوٹی قبر پہ آ کے فاتحہ پڑھ دیے کہ آج شب برات ھے۔ ھر مُردے کا عزیز اس کی قبر پہ آتا ھے مگر تجھے تو پتہ بھی نہیں ھوگا کہ تیرا باپ کہاں دفن ھے۔ اب تو مجھے بھی اپنا نشان نہیں معلوم۔ میرے حصے کی دوگز زمین باقی ھے یا نہیں۔ کہ ھر چیز تنگ ھوچکی ھے ۔۔ زمین ۔۔ آسمان ۔اس عذاب سے مجھے نجات دلادے''

جب تم ذرا بڑی ہوگئیں تو میں نے تمہیں اسکوٹر پہ گھمانا شروع کیا۔ تمہارے لیے ہم نے ایک چھوٹا سا پیارا سا پہاڑی لڑکا رکھ لیا تھا۔ وہ تمہیں گود میں لے کر پیچھے بیٹھ جاتا۔ میں آہستہ آہستہ احتیاط سے اسکوٹر چلاتا اور تم کلکاریاں مار کے ہنستیں۔ جس دن میں نے یہ دنیا چھوڑی اس سے پچھلی شام میں یونہی بلاوجہ دو گھنٹے تک چکر لگاتا رہا۔ تم گیارہ مہینے اور انیس دن کی ہو چکی تھیں اور بڑے مزے میں بڑے اعتماد کے ساتھ آگے کھڑی ہو جاتی تھیں۔ ننھے ننھے چوں چوں کرتے ہوئے جوتے پہنے۔ پتہ نہیں کیوں اس دن میرا جی چاہ رہا تھا کہ تمہیں اس اسکوٹر سے اتاروں ہی نہیں۔ تم یونہی کھڑی رہو میں چلاتا رہوں چلاتا رہوں۔ اسی طرح کھڑے کھڑے اسی طرح چلتے چلتے تمہارا قد بڑھتا جائے۔

تمہارے بال لمبے ہوتے جائیں

میرا سر سفید ہو جائے

بس اس کے بعد ہم دونوں ساتھ ساتھ نہ چل سکے میرا سفر تمام ہوا۔

مجھے نہیں معلوم تم اتنی دور کیسے پہنچیں۔ پھولوں پہ ہولے ہولے پاؤں رکھتیں۔ یا راستے کے کنکر پتھروں سے لہولہان ہوتیں۔

مجھے یقین ہے تمہارا سفر آرام سے طے ہو رہا ہوگا۔ ہم دونوں نے تمہارے لیے بہت سے خواب بُنے تھے۔ بہت سے سپنے سجائے تھے اور تمہاری ماں کے پاس وہ سب کچھ تھا جس سے ان خوابوں کو حقیقت میں بدلا جا سکتا ہے۔ کاش میں بھی اس قابل ہوتا۔

مگر میری بچی میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ موت بغیر خبردار کیے میری طرف نہ بڑھتی، ایک لمحے میں مجھے دبوچ نہ لیتی تو میں تیری جھولی دنیا کی ہر خوشی سے بھر دیتا۔ تیری زبان سے نکلے ہر لفظ کو پورا کرتا۔ مگر اس وقت تو تو نے اپنی زبان سے ''بابا مام ما'' کے علاوہ کچھ کہنا سیکھا ہی نہ تھا۔ یہی لفظ میرا پیچھا کرتے رہیں گے۔ جب تک تو مجھے معاف نہ کر دے گی لیکن کب ۔۔۔؟

کیا میں اتنا طویل عذاب برداشت کر سکوں گا۔؟

قبر کی سخت مٹی میں میری ہڈیاں چٹخ رہی ہیں۔ ریزہ ریزہ ہو رہی ہیں۔ میری ٹوٹی پھوٹی قبر پہ آ کے فاتحہ پڑھ دے کہ آج شب برات ہے۔ ہر مُردے کا عزیز اس کی قبر پہ آتا ہے مگر تجھے تو پتہ بھی نہیں ہوگا کہ تیرا باپ کہاں دفن ہے۔ اب تو مجھے بھی اپنا نشان نہیں معلوم۔ میرے حصے کی دوگز زمین باقی ہے یا نہیں۔ کہ ہر چیز تنگ ہو چکی ہے ۔۔۔ زمین ۔۔۔ آسمان ۔۔۔

اس عذاب سے مجھے نجات دلا دے۔

میری بچی۔ میری لاڈلی۔ جس کے لیے میں جیا، جس کے لیے بے وقت موت کا زہر پینا پڑا۔ صرف تو مجھے اس عذاب سے نجات دلا سکتی ہے۔

''اماں۔ اماں۔ کوئی ہے۔''

''کوئی نہیں''

نہیں یہ میں ہوں۔ تیرے باپ کی بھٹکتی، بے قرار بے چین روح۔

□□□

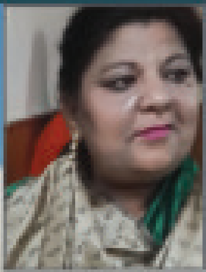

رضیہ حیدر خان

غزل

اشک آنکھوں میں شب و روز بھرے بیٹھی ہوں
میں زمانے سے کئی [illegible] بیٹھی ہوں

اک عجب کشمکش ہے مقدر میرا
میں اندھیرے میں اندھیروں سے پرے بیٹھی ہوں

مجھ کو معلوم ہے وہ شخص نہیں آنے کا
میں کہ آہٹ پہ مگر کان دھرے بیٹھی ہوں

تیری نظروں میں کھٹکتی ہوں میں کانٹے کی طرح
اپنی آنکھوں میں تیرے اشک بھرے بیٹھی ہوں

اہل خانہ کو ہے عجلت کہ میری سانس کٹے
اور میں ہوں کہ کئی دن سے مرے بیٹھی ہوں

کتنی جلدی تھی مجھے لوٹ کے گھر آنے کی
اور میں ہاتھ پہ آپ ہاتھ دھرے بیٹھی ہوں

ایک لمحے کا بھروسہ بھی نہیں ہے رضیہ
اور میں عمر کا سامان کرے بیٹھی ہوں

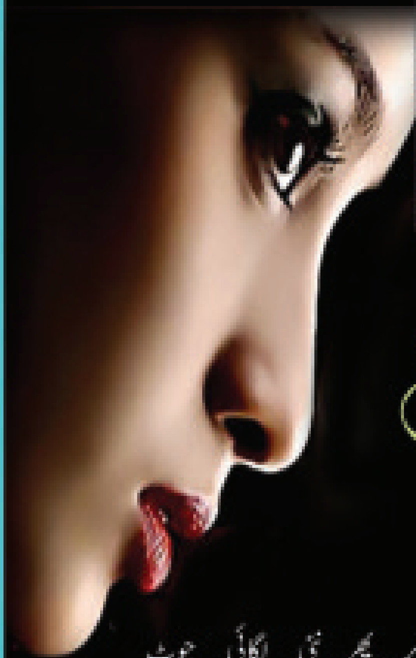

عصمت زیدی

غزل

چوٹ پر پھر نئی لگائی چوٹ
جبکہ دیتی رہی دہائی چوٹ

اس زمانے کی کج ادائی سے
کون ہوگا نہ جس نے کھائی چوٹ

اپنے ہی درد سے کہاں فرصت
کیسے سمجھے کوئی پرائی چوٹ

مشتہر ہو نہ راز درد نہاں
اس نے اس خوف سے چھپائی چوٹ

آج ناسور بن کے ابھری ہے
مدتوں کی پلی پلائی چوٹ

کر کے محسوس اپنی شدت کو
کس رعونت سے مسکرائی چوٹ

ساجدہ زیدی

کلیاں — نیلا آسمان — زنجیریں

(عورت کے نام)

مرے احساس کی وادی میں کلیاں مسکراتی ہیں
مگر میں چن نہیں سکتی
میں لمحوں میں سفر کرتی ہوں
تابندہ اُفق کے اُس کنارے تک
جہاں آکاش دھرتی کے لبوں کو چومتا ہے
سانس لیتا ہے
مرے ہاتھوں کی ریکھاؤں میں
جانے کیسی زنجیریں پڑی ہیں
روزِ اول سے
میں یہ زنجیرِ آہن توڑ کر
روزِ ابد تک جا نہیں سکتی
میں کلیاں چُن نہیں سکتی
مرے جذبوں کے گلستاں میں سبزہ سر اٹھاتا ہے
ہوا مجھے سروں میں گنگناتی ہے
فضائیں رقص کرتی ہیں
خدا آواز دیتا ہے
میں سربیوڑا کے کھڑی ہوں
دیارِ روح میں اک ان سنا نغمہ مچلتا ہے
میں اس نغمے کو لب تک لا نہیں سکتی
مرے تپتے بدن پر
سبز شاخوں کی پھواریں سوکھ جاتی ہیں
میری آنکھوں کی جھیلوں میں
منور لاجوردی آسماں کا عکس ہوتا ہے
اُفق کے پار اک کھڑکی سی کھلتی ہے
سوادِ وقت کی ساری طنابیں ٹوٹ جاتی ہیں

مگر بخ بستہ دیواریں
مجھے ہر سمت سے یوں گھیر لیتی ہیں
میں پرواز تمنا کر نہیں سکتی
مری آنکھوں کو نیلا آسماں حسرت سے تکتا ہے

کئی عمریں گزار آئی
کئی دنیائیں چھان آئیں
کئی صحراؤں میں نقشِ قدم چھوڑے
کئی دریا لہو کے پار کر آئی
کئی آتش کدوں میں جذبِ دل کندن بنا آئی
مگر اب بھی مری زنجیرِ آہن کھڑکھڑاتی ہے

مجھے جب جب بھی نیلا آسماں حسرت سے تکتا ہے
میں اپنی آتشِ دل سے جلا دیتی ہوں
اُس زنجیر کی کڑیاں
ستاروں تک پہنچتی ہوں
مدارِ نور میں مہتاب کی ہم رقص ہوتی ہوں۔

شفیق فاطمہ شعریٰ

نواپیرائے کارگہہ شیشہ گری

طلسم صوت جس کا نام تھا پھر وہ گھما آئی
تھکن کی نیند جیسی گنگناتی جھومتی
ٹھنڈی ہوا آئی
جہان شور و شر لیکن
کسی کو چین سے کب سونے دیتا ہے۔
صدائیں کتنی انمل
ایک لایعنی تسلسل میں۔
ترانے، اشتہاری چٹکلے، قوالیاں
اقوال زریں، ڈائیلاگ، اشعار ناموزوں
پکاریں، ماجھیوں کے گیت
پھر "ستیم شرن، سکھم شرن، دھرم شرن میں
جا رہا ہوں میں"
سریلے شور کا رتھ بان کہتا ہے
وہ نیرنگ مظاہر کا کھلا شوکیس
سوتا رہ گیا کیسے۔
تبھی بیدار سوناہٹ بے سان وگماں
اک دور کی آواز سے گونجا
کسی گوشے سے اک نوعمر خوش الحان قاری کی صدا آئی

سنایا جا رہا تھا یوسف صدیق کا قصہ
گداز جاوداں میں
ان لکھی جاتک کتھاؤں کے
وحوش و طیر
لتائیں، بیگھ، دوت، اشجار۔

یہ انساں بھی عجب ہے
زمانوں سے اسے ہم
جانتے پہچانتے ہیں
راز سربستہ مگر اس کا

وہی جانے جو ہے تصویر گر اس کا۔
صداقت ہی کا سارا کھیل ہے بھیا
اسی سے ایک ذرہ روکش مہر و مہہ و اختر
صداقت جینے مرنے، ٹوٹنے جڑنے، الجھنے در گذرنے کی
کہاں ہے۔
۔ہویدا ایک لوح سنگ جس پر
ابھر آئے وہ ایوان مدائن کے کھنڈر۔ آئینہ عبرت

کہاں کی خسروی آزادگی سرمستی و شوخی
وہی اندھا کنواں خناس سو تیلے رویہ کا
گذرتے قافلوں کی آہٹوں سے دور
جرس کی بانگ سے مجبور۔
۔نہیں یہ زیادتی ہے، ہوش میں آؤ
کوئی یوں کفر بکتا ہے؟
ادھر دیکھو
ہوا زنداں کی کیا سے کیا بنا دیتی ہے انساں کو
اگر زنداں ہو قزاقوں اٹھائی گیروں کا مسکن
وہ زنداں اور ہے لیکن
نشیمن گیر ارباب ہمم جس میں
وہی تو خوب تر محبوب تر اس کی نگاہوں میں ہے
ایسے جشن دعوت خوان نعمت سے
جہاں اس کی طلوع صبح صادق ہی نمود
اک عاج کا مہرہ
بساط بزم کی رونق
سلاخوں میں مقفل یا سلاخوں پار
کھلی دنیا میں، جو ایسا مرا
معاصر علتوں سے
ظاہر و باطن سلامت ہے
وہی لاریب دارائے کرامت ہے۔ نواپیرا

علینا عترت

غزلیں

خزاں کی زردی رنگت بدل بھی سکتی ہے
بہار آنے کی صورت نکل بھی سکتی ہے

جلا کے شمع اب اٹھ اٹھ کے دیکھنا چھوڑو
وہ ذمے داری سے از خود پگھل بھی سکتی ہے

ہے شرط صبح کے رستے سے ہو کے شام آئے
تو رات اس کو سحر میں بدل بھی سکتی ہے

ذرا سنبھل کے جلانا عقیدتوں کے چراغ
بھڑک نہ جائیں کہ مسند یہ جل بھی سکتی ہے

ابھی تو چاک پہ جاری ہے رقص مٹی کا
ابھی کمہار کی نیت بدل بھی سکتی ہے

یہ آفتاب سے کہہ دو کہ فاصلہ رکھے
تپش سے برف کی دیوار گل بھی سکتی ہے

ترے نہ آنے کی تشریح کچھ ضروری نہیں
کہ تیرے آتے ہی دنیا بدل بھی سکتی ہے

کوئی ضروری نہیں وہ ہی دل کو شاد کرے
علینا آپ طبیعت بہل بھی سکتی ہے

شام کے وقت چراغوں سی جلائی ہوئی میں
گھپ اندھیروں کی منڈیروں پہ سجائی ہوئی میں

دیکھنے والوں کی نظروں کو لگوں سادہ ورق
تیری تحریر میں ہوں ایسے چھپائی ہوئی میں

خاک کر کے مجھے صحرا میں اڑانے والے
دیکھ رقصاں ہوں سرِدشت اڑائی ہوئی میں

کیا اندھیروں کی حفاظت کے لیے رکھی ہوں
اپنی دہلیز پہ خود آپ جلائی ہوئی میں

لوگ افسانہ سمجھ کر مجھے سنتے ہی رہے
درحقیقت ہوں حقیقت سے بنائی ہوئی میں

میری آنکھوں میں سمایا ہوا کوئی چہرا
اور اس چہرے کی آنکھوں میں سمائی ہوئی میں

کتنی حیران ہے دنیا کے مقدر کی نہیں
اپنی تدبیر کے ہاتھوں ہوں بنائی ہوئی میں

میرے انداز پہ تا دیر علینا وہ ہنسا
ذکر میں اس کے تھی یوں خود کو بھلائی ہوئی میں

لذیذ پکوان

سندھی بریانی

اجزا۔: ایک کلو چکن یا مٹن، ایک کلو چاول، 400 گرام آلو، ٹماٹر، 250 گرام دہی، 1 ٹی اسپون سرخ مرچ پاؤڈر، نمک 4 ٹی اسپون، 3 میڈیم پیاز، لہسن پیسٹ، 2 ٹی سپون، 2 ٹی سپون ادرک پیسٹ، 8 عدد چھوٹی الائچی، 4 بڑی الائچی، لونگ 10 عدد، 10 عدد کالی مرچ، زیرہ ایک ٹی اسپون، 1 دار چینی، 2 تیز پات کے پتے، 250 گرام آئل، 6 سبز مرچیں، ہرا دھنیا 2 ٹیبل اسپون کٹی ہوئی، 2 ٹیبل اسپون پودینہ، 1 ٹیبل اسپون کیوڑہ، فوڈ کلر پیلا 2 چٹکیاں، ایک ٹیبل اسپون شوگر، 10 سے 15 عدد آلو بخارے۔

ترکیب: لچھے دار پیاز کاٹ کر آئل میں فرائی کر لیں اور براؤن ہونے کے بعد آدھے نکال کر علیحدہ رکھ لیں اور آدھے پیاز میں لہسن، ادرک، نمک، مرچ، الائچی، کالی مرچ، زیرہ، دار چینی، لونگ، تیز پات اور دہی ڈال دیں۔ اس کو پانی خشک ہونے تک فرائی کریں اور پھر اس میں مٹن یا چکن ڈال دیں۔ مٹن کی صورت میں اتنا پانی ڈالیں کہ گوشت گل جائے اور چکن کے لیے پانی کی ضرورت نہیں ہے۔ آلو کو کاٹ کر اس کے ٹکڑے کر لیں اور ہاف ابال لیں۔ چاولوں کو پانی میں دو گھنٹے بھگونے کے بعد ان کو ہاف ابال کر پانی سے دھو لیں۔ چاپ ٹماٹر، ہری مرچیں، دھنیا، پودینہ، آلو بخارے، ابلے ہوئے آلو اور فرائی پیاز ان سب کو گوشت گل جانے کے بعد اس میں ڈال دیں اب چاولوں کی ایک لے لگا کر اس پر گوشت کا مصالحہ ڈال دیں اور اوپر کیوڑہ، فوڈ کلر اور شوگر ڈال کر دم دے دیں۔

شاہ جہانی کوفتے

کوفتوں کے اجزا: چکن کا قیمہ ایک کلو۔ سبز الائچی آٹھ عدد، بادام آٹھ عدد، گرم مصالحہ پاؤڈر ایک چائے کا چمچ، نمک حسب ضرورت، ڈبل روٹی کے سلائس چار عدد، ہرا دھنیا ایک گٹھی (باریک کتر لیں)۔ ہری مرچیں چھ عدد (باریک کاٹ لیں)۔ پودینہ ایک گٹھی (باریک کتر لیں) تیل حسب ضرورت۔

گریوی کے اجزا: تیل ایک پیالی، پیاز تین عدد (باریک کاٹ لیں) دہی ایک پیالی، لہسن ادرک پیسٹ ایک کھانے کا چمچ، سفید زیرہ ایک چائے کا چمچ (بھون کر پیس لیں) سفید مرچ (پسی ہوئی) ایک

چائے کا چمچ، نمک حسب ضرورت۔ گرم مصالحہ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ، فریش کریم ایک پیکٹ، بادام دس عدد (ابال کر کاٹ لیں) ہرا دھنیا ایک

گٹھی باریک کتر لیں) ہری مرچیں چار عدد (باریک کاٹ لیں)

ترکیب: قیمے میں چھوٹی الائچی، بادام، پسا گرم مصالحہ، نمک اور ڈبل روٹی کے سلائس ملا کر چوپر میں پیس لیں۔ پھر پسے ہوئے قیمے میں ہرا دھنیا، پودینہ اور ہری مرچیں ملا کر کوفتے بنا لیں۔ اب تمام کوفتوں کو ایک پین میں شیلو فرائی کر لیں۔ جب گولڈن براؤن ہو جائیں تو نکال لیں۔ ایک پھیلی ہوئی پتیلی میں گھی گرم کریں اور اس میں پیاز براؤن کر کے نکال لیں۔ جب پیاز خستہ ہو جائے تو اسے کچل کر دہی میں ملائیں اور پھر اس میں ادرک، لہسن، سفید مرچ، نمک، زیرہ اور گرم مصالحہ بھی شامل کر دیں۔ اب اس مصالحے کو بھونیں اور اس میں کوفتے شامل کر دیں۔ ایک پیالی گرم پانی شامل کریں اور پانچ منٹ کے لیے دم پر رکھیں۔ اس کے بعد فریش کریم شامل کریں اور بادام، ہرے دھنیے اور ہری مرچوں سے گارنش کر کے پیش کریں۔

ویجی ٹیبل بریانی

اجزا: لمبے باسمتی چاول ایک کپ، لونگ دو عدد، الائچی کے دانے ایک کھانے کا چمچ، سبزیوں کی یخنی دو کپ، لہسن دو جوئے، پیاز ایک عدد باریک کٹی ہوئی، زیرہ ایک چائے کا چمچ، دھنیا ایک چائے کا چمچ پسا ہوا، ہلدی آدھا چائے کا چمچ، سرخ مرچ پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ، آلو ایک عدد بڑا سائز ٹکڑوں میں کٹا ہوا۔ گاجر دو عدد باریک کٹی ہوئی، گوبھی آدھا عدد، سیم کے بیج یا مٹر دو اونس، لیموں کا رس دو کھانے کے چمچ، نمک/ سیاہ مرچ حسب ذائقہ پسی ہوئی، ہرا دھنیا/ پودینہ چار کھانے کے چمچ، تیل چار کھانے کے چمچ۔

ترکیب: ایک بڑی دیگچی میں سبزیوں کی یخنی لونگ اور دار چینی کے ساتھ چاولوں کو ابالنے کے لیے چڑھا دیں اور دیگچی پر ڈھکن ڈھک دیں بیس منٹ بعد یخنی خشک ہو جائے گی اور چاول تقریباً گل جائیں گے۔ اب ایک بلینڈر میں لہسن، پیاز، زیرہ، دھنیا، ہلدی سرخ مرچ پاؤڈر اور نمک، مرچ کو تھوڑے سے پانی کے ساتھ ملا کر پیس لیں۔ اس پسے ہوئے مصالحے کو ایک دیگچی میں ڈال کر چولہے پر چڑھا دیں اور دو منٹ کے لیے پکائیں۔ دو منٹ بعد اس مصالحے میں تیل، تمام سبزیاں اور چھ کھانے کے چمچ پانی ڈال کر مزید بارہ منٹ تک پکائیں۔ جب پک جائے تو اس تمام آمیزے کو اچھی طرح بھون لیں اس آمیزے میں چاول شامل کر دیں اوپر سے لیموں کا عرق چھڑک دیں اور پھر ڈھک کر دم پر رکھ دیں۔ یہاں تک کہ سبزیاں اور چاول مناسب حد تک گل جائیں۔ اب چاولوں کو ڈش میں نکال لیں اور دھنیا پودینہ ڈال کر پیش کریں۔

پیزا ٹوسٹ

اجزا: مرغ کا ایک چیسٹ پیس، کیچپ آدھا کپ، چلی ساس تین کھانے کے چمچ، نمک ایک چائے کا چمچ، ادرک (پسی ہوئی) ایک چائے کا چمچ، لہسن ایک چائے کا چمچ، چیز آدھا پیکٹ (کرش کر لیں) ڈبل روٹی کے بڑے سلائسز دس عدد، کالی مرچ حسب ذائقہ۔

ترکیب: مرغ کے گوشت میں ادرک، لہسن نمک اور کالی مرچ ڈال کر ابال لیں اور ریشے کر لیں۔ کیچپ میں چلی ساس ملا لیں۔ ڈبل روٹی کے سلائس کو کٹر یا کسی ڈھکن سے گول شیپ میں کاٹ لیں۔ اوون گرم کریں اور ٹرے گریس کر کے ڈبل روٹی کے سلائس ٹرے میں رکھیں۔ اوپر سوس لگائیں۔ پھر مرغ کے گوشت کے ریشے رکھیں۔ اس کے اوپر بہت سارا چیز ڈالیں۔ اب اسے اوون میں پانچ سے دس منٹ تک رکھیں۔ چیز پگھل جائے اور ڈبل روٹی ٹوسٹ ہو جائے تو نکال کر گرما گرم سرو کریں۔

گرمیوں میں جلد کی حفاظت

گرمیوں میں جلد کی حفاظت

گرمیوں میں جلد کی حفاظت کرنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ اگر آپ اپنی جلد کی حفاظت نہیں کرتے تو آپ کی جلد اپنی خوبصورتی اور چمک کھونے لگتی ہے اور آپ احساس کمتری کی شکار رہتی ہیں ذیل میں ہم آپ کو بتائیں گے کہ گرمیوں میں کیسے آپ اپنی جلد کو خوبصورت بنا سکتی ہیں۔

☆ گرمیوں میں جلد کی نمی اور خوبصورتی برقرار رکھنے کے لیے اسپیشل اسکین کریم کا استعمال کریں اور اسی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پانی پئیں کیونکہ پانی آپ کی جلد میں نمی کی مقدار کو معتدل رکھتا ہے۔

☆ دو چمچ لیمن جوس، دہی اور شہد کو ملا کر پیسٹ تیار کر لیں اور پھر اس پیسٹ کو چہرے اور ہاتھوں پر لگائیں پندرہ منٹ کے بعد جب ماسک سوکھ جائے تو ایک کپڑے کو لیمن جوس میں ڈبو کر اس سے اس کو صاف کر لیں۔

آدھا چمچ لیمن جوس اور دو چمچ دہی ملا کر ماسک تیار کر لیں اس کے بعد جلد کو صاف کر لیں اور ماسک کو جلد پر لگائیں پندرہ منٹ بعد جب ماسک سوکھ جائے تو ایک کپڑے کے ٹکڑے کو نیم گرم پانی میں بھگو کر اتاریں۔

اگر آپ گرمیوں میں نرم و ملائم اور خوبصورت جلد چاہتی ہیں تو اس عمل کو ہفتے میں کم از کم دو بار ضرور کریں۔

چہرے کے داغ دھبے

جلد پر کیل مہاسے یا داغ دھبے ہر کسی کو ناگوار اور برے لگتے ہیں۔ جلد پر داغ دھبوں کی بڑی وجہ آئل کا موجودہ ہونا ہے اور اسی لیے چکنی جلد والے افراد ان کا زیادہ شکار ہوتے ہیں۔ بازار میں یوں تو بہت سی کریمز اور پراڈکٹس ملتی ہیں اس کے علاوہ آپ جلد کے داغ دھبوں کے لیے بہت سے گھریلو ماسک بھی استعمال کر سکتی ہیں جیسے

☆ جب ہم گھر پر کافی بناتے ہیں تو اس کا پوگھ بچ جاتا ہے۔ اس پوگھ کو لیں اور اس کو جلد کے اس حصے پر رگڑیں جہاں داغ دھبے اور کیل مہاسے موجود ہیں۔ اس کے بعد بیس منٹ تک ایسے ہی چھوڑ دیں اور پھر نیم گرم پانی سے دھو لیں اس سے چند ہی دنوں میں جلد صاف ہو جائے گی۔

اکثر اوقات جلد پر داغ دھبوں کی وجہ غیر متوازن غذا کھانا بھی ہوتا ہے اور زیادہ چکنائی کی غذائیں کھانے سے بھی جلد پر داغ دھبے پڑ جاتے ہیں۔ اس کے لیے آپ گاجر کا جوس پئیں، گاجر کو کچا کھائیں یا گاجروں کا جوس کاٹن کی مدد سے داغ دھبوں پر لگائیں اس سے جلد ہی جلد صاف و شفاف ہو جائے گی۔

☆ ایک چمچ شہد کو ایک چمچ دہی کے ساتھ ملا لیں۔ اب پہلے چہرے کو اچھی طرح دھو کر خشک کر لیں اور پھر شہد اور دہی کے مکسچر کو چہرے پر لگائیں

اور دس منٹ تک چھوڑ دیں۔ اس کے بعد چہرے کو نیم گرم پانی سے دھو لیں۔

آپ نے سنا ہوگا کہ کچھ لوگ داغ دھبوں کو ختم کرنے کے لیے ٹوتھ پیسٹ چہرے پر لگانے کا مشورہ دیتے ہیں اور کم عقلی میں اسے لگانے سے نہ صرف جلد خراب ہو جاتی ہے بلکہ سرخ بھی ہو جاتی ہے اس لیے ٹوتھ پیسٹ کو صرف دانتوں کے لیے استعمال کریں جلد کے لیے نہیں۔

آنکھوں کی دیکھ بھال

آنکھیں ہمارے جسم کا اہم حصہ ہیں ان سے نہ صرف ہم دنیا کے خوبصورت اور حسین نظارے دیکھتے ہیں بلکہ اگر آنکھیں نہ ہوں تو ہم بہت سے اہم کام بھی سر انجام نہیں دے سکتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی آنکھوں کی مناسب دیکھ بھال اور حفاظت کریں تا کہ آنکھیں تندرست اور صحت مند رہیں اور ہم دنیا کی نعمتوں سے استفادہ حاصل کر سکیں۔ آنکھوں کی مناسب دیکھ بھال کے لیے ان ہدایات پر عمل کریں۔

☆ صحت مند اور ایسی غذاؤں کا استعمال کریں جن میں پروٹین اور وٹامن مناسب مقدار میں ہوں کیونکہ وٹامن اور پروٹین ہماری آنکھوں کو خشک نہیں ہونے دیتے اور ہماری نظر کو بھی ٹھیک کرتے ہیں۔

☆ اپنی غذا میں تازہ پھل اور سبزیوں کا استعمال کریں مثلاً مالٹے میں وٹامن سی پایا جاتا ہے جو جلد کے ساتھ ساتھ آنکھوں کو بھی نمی دیتا ہے۔ گاجر میں وٹامن اے پایا جاتا ہے جو نظر کو تیز کرتا ہے، اس کے علاوہ وٹامن ای آئل اور تیل میں پایا جاتا ہے جو ہماری آنکھوں کی صحت کے لیے بہترین ہے۔

☆ ایسی غذاؤں اور کھانوں کا استعمال نہ کریں جن میں نیکوٹین اور الکوحل موجود ہوں۔ جاپانیز میڈیکل ریسرچ کے مطابق ایسی غذائیں وقتی لذت اور ذائقہ تو فراہم کرتی ہیں لیکن یہ جگر کے مرض مثلاً لیور کینسر، ہپی ٹائٹس جیسے موذی مرض کے ساتھ ساتھ آنکھوں کی خرابی کا باعث بھی بنتی ہیں۔

☆ اگر آنکھوں میں کام کے دوران یا کمپیوٹر پر کام کرتے ہوئے جلن محسوس ہو تو کچھ وقت کے لیے کام چھوڑ کر آنکھوں کو بند کر لیں اور دونوں انگلیوں سے ہلکا ہلکا رگڑیں اس کے بعد جب تھوڑے بہت آنسو نکل جائیں تو ایسے ہی آنکھوں کو پانچ منٹ تک بند رکھیں اس کے بعد ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار کر آنکھیں صاف کر لیں۔ اس کے علاوہ آپ آنکھوں میں آئی کیئر ڈراپز بھی ڈالیں تو بہتر ہیں۔

پیروں کی دیکھ بھال

گرمیوں میں باقی موسموں کی نسبت پاؤں کی زیادہ اور بہتر طریقوں سے دیکھ بھال کرنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ گرمیوں میں پاؤں زیادہ تر آلودگی اور گرد وغیرہ سے متاثر ہوتے ہیں۔ اگر گرمیوں میں پاؤں کی مناسب دیکھ بھال نہ کی جائے تو ایڑیاں پھٹ جاتی ہیں پاؤں کی جلد خراب ہو جاتی ہے اور پاؤں دکھنے لگ جاتے ہیں گرمیوں میں پاؤں کی مناسب دیکھ بھال کے لیے ان ہدایات پر عمل کریں۔

☆ گرمیوں میں پاؤں کو روزانہ باقاعدگی سے دھوئیں اس سے پاؤں سے میل اور گندگی بھی ختم ہوگی اور پاؤں خوبصورت اور صحت مند رہیں گے۔

☆ گرمیوں میں ہفتے میں دو سے تین بار پاؤں کو پیڈی کیور ضرور کریں۔ اس سے پاؤں میں موجود مردہ خلیے نکل جائیں گے اور پاؤں نرم و ملائم بنیں گے۔ پیڈی کیور کے علاوہ آپ پاؤں کو فٹ باتھ یا فٹ مساج بھی کر سکتی ہیں۔

☆ اس کے علاوہ کریم اور لوشن کا استعمال کریں جو پاؤں میں ٹھنڈک کا احساس پیدا کریں اس سے ایک تو پاؤں گرمی کے اثرات سے محفوظ رہیں گے اور ساتھ میں پاؤں کے پسینے سے پیدا ہونے والی بدبو بھی ختم ہوگی۔

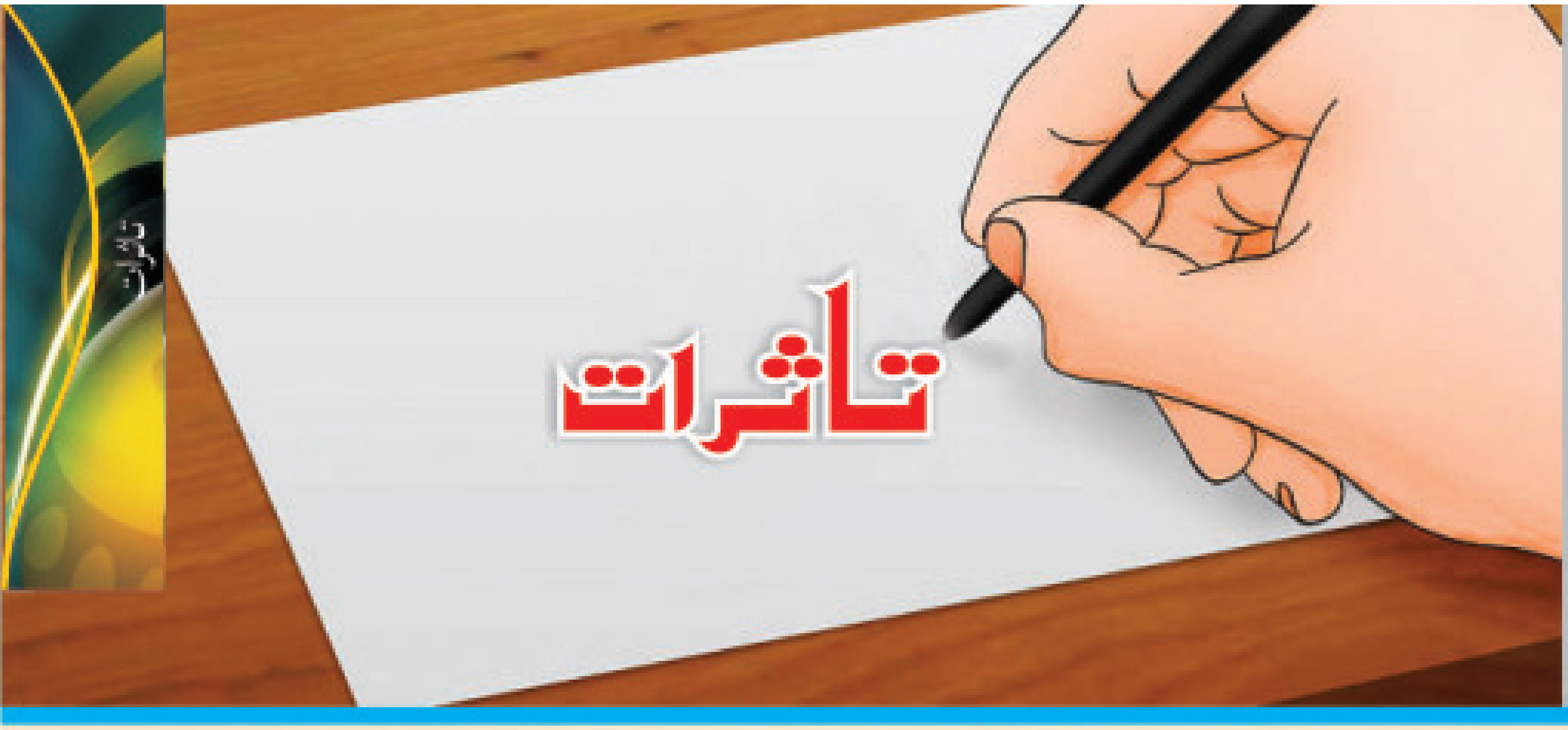

تاثرات

محترمی ایڈیٹر صاب! السلام علیکم۔ 'خواتین دنیا' کی اشاعت کی خبر سے دل باغ باغ ہوا۔ یقیناً ہی یہ ماہنامہ 'اردو دنیا' اور 'بچوں کی دنیا' کی طرح مقبول عام و خاص ہوگا۔ میری نیک خواہشات اور مبارکباد قبول فرمائیں۔ زرسالانہ ارسال کر چکی ہوں۔ پہلا شمارہ ارسال کریں تو عین نوازش ہوگی۔ بی اماں اور نشاط النساء بیگم پر دو مضامین پیش ہیں۔ پسند آئیں تو شامل اشاعت کریں۔ شکریہ۔

بانو سرتاج، آکاش وانی، سول لائنس، چندراپور۔ (مہاراشٹر)

ذی شعور و ذی وقار، محترم مدیر ماہنامہ ''خواتین دنیا'' دہلی۔ سلام و تعظیم۔ مارچ 2017 کا اولین شمارہ 'خواتین دنیا' پڑھ کر بہت زیادہ خوش ہوں صنفِ نازک کی جماعت کا طرفدار رسالہ بڑا حوصلہ افزا ہے۔ میرا شعری کلام ہندو بیرونِ ہند کے مختلف اردو رسائل میں مدتہائے دراز سے شائع ہوتا رہا ہے، سوچا کہ خوبصورت ماہنامہ 'خواتین دنیا' میں بھی غزلیں بھیج دوں۔ اب تک میرے چار شعری مجموعے اردو اکادمی لکھنؤ (یوپی) کے مالی تعاون سے شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں 'ردائے غزل' 1998، 'عطائے رسول'' 2008، 'نمائے فکر' 2010، 'متاعِ چشم نم' 2015 اللہ کرے 'خواتین ماہنامہ' کو حیات جاوداں ملے آمین۔

پورا شمارہ خواتین کی جرأت متانت کا آئینہ دار ہے یہ حقیقت ہے کہ آج کی خاتون اپنے اندر حقائق سے آنکھیں ملانے کی بھرپور طاقت رکھتی ہے اس وقت اپنا ہی ایک شعر درج کروں گی جو بالکل سچا ہے۔

تتلیوں کی طرح اڑتی ہے خلا میں دیکھو
صنف نازک کے بھی اب پاؤں میں زنجیر نہیں

اتنا خوبصورت رسالہ شائع کرنے پر دفتر 'خواتین دنیا' کے تمامی اراکین صاحبان کو میری طرف سے دلی مبارکباد پیش ہے۔

ریحانہ عاطف خیرآبادی، خیرآباد، اودھ، ضلع سیتاپور (یوپی)

مکرمی، 'خواتین دنیا' کا دوسرا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ یہ شمارہ بھی مضامین کی ترتیب وتہذیب کے اعتبار سے معیاری کہا جا سکتا ہے۔ سارہ حمید پر نصرت جہاں کی تحریر قابل تعریف ہے۔ انجم فریدی کا مضمون 'سیاہ چادر کے پار' اور نوشابہ سعدیہ کا 'تحریک آزادی نسواں میں' نذر سجاد حیدر کا حصہ بھی بہت اچھے لگے۔ لیکن غزالہ فاطمہ کا تنقیدی مضمون روایتی سا ہے۔ کہانیوں کا حصہ بھی کافی بھاری بھر کم تھا اور شعری کو نہ بھی۔ کوشش یہ کی جائے کہ خواتین کے اس واحد رسالے کو محض ادب وتنقید کے حوالے نہ کیا جائے بلکہ ایسے مضامین کی تعداد بڑھائی جائے جو آج کے دور میں خواتین کی صورتحال کو ظاہر کرتے ہوں، ان کو آگے بڑھانے میں معاونت کریں، جو لڑکیاں زیر تعلیم ہوں ان کی رہنمائی کریں زیادہ زیادہ کوشش کی جائے کہ خواتین تنظیموں کی سرگرمیاں، خواتین صحافیوں کے انٹرویوز، تعلیم کی ماہرین عورتوں کے تجربات وغیرہ وغیرہ کو شامل کیا جائے۔

خواتین ادیبوں اور نقادوں کے لیے بہت سے رسائل ہیں۔ کہانیاں بھی عام طور پر چھپتی ہی رہتی ہیں لیکن خواتین کے لیے مشعل راہ بننے والا رسالہ کوئی نہیں ہے بالخصوص اردو میں تو اس کا فقدان ہے خواتین دنیا کو اگر اس نہج پر شائع کیا جائے تو یہ ایک بڑی خدمت بھی ہوگی اور حکومت کی خواتین کو خودکار بنانے کی پالیسی کو بھی تقویت ملے گی۔ شکریہ

بیگم فہیمہ خاتون، رانچی، جھارکھنڈ

مکرمی! خواتین دنیا کا نیا شمارہ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ سارہ حمید، میڈم کیوری پر لکھے گئے فی مضامین کا معیاری اور معلوماتی ہیں۔

غزلوں کا حصہ بھی داد کے قابل ہے اور کہانیاں بھی لاجواب ہیں۔ خواتین دنیا کا یہ شمارہ ہر پہلو سے قابل تعریف ہے۔ کاغذ، چھپائی، صفحات کی سجاوٹ اور حسن ترتیب سب کچھ منفرد اور معیاری ہے کونسل کے ڈائرکٹر جناب ارتضیٰ کریم نے اس رسالے کو جاری کرکے اردو داں خواتین پر زبردست احسان کیا ہے۔ تاریخ ان کو ہمیشہ عزت کے ساتھ یاد کرے گی۔

درخشاں انجم، کھنہ، پنجاب

مکرمی! 'خواتین دنیا' کی اشاعت پر ڈھیروں مبارکباد قبول فرمائیں۔ جون 2017 کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے جس کے ٹائٹل پر مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل عالی جناب پرکاش جاوڈیکر اور کونسل کے ڈائرکٹر جناب ارتضیٰ کریم صاحب 'خواتین دنیا' کا اجراء جوش و جذبے کے ساتھ فرما رہے ہیں۔ اس سے پہلے کے شمارے مجھے حاصل نہیں ہو سکے۔ یہ شمارہ بھی میرے ایک عزیز ترین دوست کسی طرح حاصل کرکے لائے ہیں۔ بہرحال خواتین دنیا ہر اعتبار سے تعریف کے قابل ہے۔ کچھ نئے قلمکاروں کو اس میگزین میں شامل کیا گیا ہے یہ بھی اچھا قدم ہے۔ نصرت جہاں نے سارہ حمید پر بڑا معلوماتی مضمون لکھا ہے۔ میڈم کیوری کے بارے میں جان کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ کہانیوں کا گوشہ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت اچھا لگا۔ البتہ غزلوں کے حصے پر خصوصی توجہ ضروری ہے۔ غزل کا ہر شعر ایسا نہیں ہوتا کہ اسے عالمی معیار کے جریدے میں شامل کیا جا سکے۔ خدیجہ مستور پر جو مضمون شائع کیا گیا ہے وہ اچھا تو ہے لیکن کافی کمزور سا لگا۔ کل ملا کر یہ رسالہ خوبصورت ہے اور امید ہے مستقبل میں اسے مزید سنوارنے کی کوشش کی جائے گی۔

ہما سرفراز خاں، گھونڈہ، دہلی

مکرمی! امید کہ مع الخیر ہوں گے۔ 'خواتین دنیا' واقعی ایک ایسا رسالہ ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ عرصے سے ایسے رسالے کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جو صرف خواتین کے لیے ہو۔ میں عالمی ادب کی ایک ادنیٰ سی قاری ہوں اور اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں دعویٰ کر سکتی ہوں کہ دنیا بھر میں ایسا کوئی ماہنامہ نظر نہیں آتا جس میں صرف خواتین قلمکاروں کی نگارشات کو شائع کیا جاتا ہو۔ چند ایک ہیں بھی تو اس میں بھی مرد قلم کار پر یا تو مضامین ہوتے ہیں یا پھر مرد حضرات ہی خواتین کے مسائل پر خامہ فرسائی فرماتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس اعتبار سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے سربراہ پروفیسر ارتضیٰ کریم خصوصی مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے خواتین کی خواہشات کے مطابق ایک شاندار ماہنامہ جاری کر دیا۔

خواتین دنیا پر اچھے اچھے مضامین کافی حوصلہ بخش اور متاثر کن ہیں امیدوں کی چاندنی بکھیرتے، مستقبل میں خوش آئند اجالوں کا اعلان کرتے کئی مضامین دل کو چھو گئے۔ بہرحال 'خواتین دنیا' کا ہر صفحہ منفرد اور جاذب ہے۔ میری طرف سے ایک بار پھر مبارکباد۔

مسکان ناز، حیدرآباد، آندھرا پردیش

مکرمی!

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان بلاشبہ اردو زبان و ادب کی ترویج و ارتقا اور فروغ و اشاعت کا واحد ادارہ ہے جو بقیہ تمام سرکاری اداروں سے آگے بڑھ کر کام کر رہا ہے۔ اس نے 'بچوں کی دنیا'، 'اردو دنیا' اور اب 'خواتین دنیا' جیسے عالمی معیار کے ماہنامے جاری کرکے زبان و ادب کی پر توقیر خدمت کی ہے۔ 'خواتین دنیا' تو ایک عظیم کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔

میں نے اب تک خواتین دنیا کے صرف دو ہی شمارے دیکھے ہیں اور اس کے جاذب نظر ورق ورق نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ جون کا شمارہ میں نے ابھی مکمل نہیں پڑھا ہے لیکن امید ہے یہ شمارہ بھی گذشتہ شمارے سے آگے ہی آگے ہوگا۔ اس کے مشمولات قابل تعریف، حصہ مضامین سے لے کر نثر و نظم، قانونی جانکاری، کچن کی رونق وغیرہ وغیرہ سبھی گوشے اپنی انفرادی شان کے حامل لگتے ہیں۔

چند مشوروں پر اپنی بات ختم کرتی ہوں اولاً یہ کہ اس میں خواتین کے لیے ایک کیریئر گائڈ شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ دوم نئے نئے کورسیز کی جانکاری بھی اگر اس میں دے دی جائے تو بہت اچھا رہے گا۔ ایک کالم صحت و تندرستی سے متعلق ایسا ہونا چاہیے جس میں خواتین اپنی بیماریوں کے بارے میں کسی ماہر لیڈی ڈاکٹر سے مشورہ کر سکیں یعنی خواتین اپنے امراض سے متعلق سوال کریں اور کوئی ماہر ڈاکٹر اس کا تشفی و تسلی بخش جواب دے۔ دوسرے تربیت اطفال، بچوں کو پلائے جانے والے ڈراپس اور ویکسینز کے بارے میں بھی کالم ہو۔ زچہ بچہ کی نگہداشت سے متعلق بھی اگر مواد کو جگہ دی جائے تو یہ ماہنامہ خواتین کے لیے مکمل رحمت بن جائے گا۔

آفرین خاتون، دہلی

خواتین خبرنامہ

ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی نئی چانسلر

نئی دہلی (ایس این بی) منی پور کی گورنر اور سابق مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ جامعہ اسلامیہ کی چانسلر منتخب کر لی گئی ہیں۔ یونیورسٹی سے جاری اعلامیہ کے مطابق وہ اس عہدے پر آئندہ 5 سال تک فائز رہیں گی۔ واضح رہے کہ 77 سالہ ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ کا لیفٹیننٹ گورنر (ریٹائرڈ) مسٹر ایم اے ذکی کی 5 سالہ معیاد مکمل ہونے کے بعد انتخاب عمل میں آیا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ نے اپنے اس عہدے کا چارج 26 مئی 2017 کو لے لیا ہے۔

قابل ذکر ہے کہ ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم اور معروف مجاہد آزادی مولانا ابوالکلام آزاد کی قرابت دار ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ 5 مرتبہ 1986 سے 2012 کے درمیان راجیہ سبھا کی ممبر رہ چکی ہیں۔ علاوہ ازیں محترمہ نجمہ ہپت اللہ تقریباً 16 سال تک راجیہ سبھا کی ڈپٹی چیئرمین کے طور پر خدمات انجام دے چکی ہیں۔ اس موقع پر وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے نجمہ ہپت اللہ کا جامعہ ملیہ اسلامیہ کی چانسلر منتخب کیے جانے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ڈاکٹر ہپت اللہ کی سیاسی اور سماجی دونوں خدمات سے فائدہ اٹھائے گی، ہمارے لیے یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ ہمیں ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے ان کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا۔ پروفیسر طلعت احمد نے کہا کہ ہم جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ایم اے ذکی کے بھی شکر گزار ہیں، جنھوں نے بحسن وخوبی اپنی خدمات سے جامعہ کو نوازا۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر ہپت اللہ 1993 میں بین پارلیمانی یونین کے خواتین ممبران کی اجلاس کی صدارت کر چکی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ 1999 سے 2002 تک بین پارلیمانی یونین کی صدر بھی رہ چکی ہیں۔ انھوں نے 'ایڈس اینڈ وچیز ٹو پری وینشن' عنوان سے ایک کتاب بھی تصنیف کی۔ علاوہ ازیں انسانی معاشرتی تحفظ و پائیدار ترقی، خواتین کے حالات کی بہتری اور ہندوستان و جنوبی ایشیا کے رشتوں کے بارے میں بھی ان کی تصانیف قابل ذکر ہیں۔

نوئیڈا کی طالبہ رکشا گوپال ہوئی ٹاپر

نئی دہلی (یو این آئی) مرکزی ثانوی تعلیم بورڈ (سی بی ایس ای)

نے آج 12 ویں کے امتحان کے تمام نتائج کا اعلان کر دیا۔ سی بی ایس ای کے نتائج میں اس بار بھی لڑکیوں نے بازی ماری ہے۔ نوئیڈا کی رکشا گوپال نے ملک میں پہلا مقام حاصل کیا ہے۔ انھوں نے کل 99.6 فیصد نمبرات حاصل کیے۔ چنڈی گڑھ کی طالبہ بھومی ساونت 99.4 فیصد نمرات حاصل کر کے دوسرے مقام پر اور 99.2 فیصد نمبرات کے ساتھ آدتیہ جین تیسرے مقام پر رہے۔ رکشا گوپال نے انگریزی، سیاسیات اور معاشیات میں سو فیصد نمرات حاصل کیے ہیں۔ ترقی انسانی وسائل کے وزیر پرکاش جاوڈیکر نے سی بی ایس ای کے نتائج میں ٹاپ کرنے والے بچوں کو مبارک باد دی ہے۔ سی بی ایس ای کے نتائج کے مطابق اس بار کل 82 فیصد طالب علم پاس ہوئے ہیں جو گزشتہ سال کے مقابلے میں اس بار 95 فیصد سے زیادہ نمبرات حاصل کرنے والے بچوں کی تعداد بڑھی ہے۔ اس بار 12 ویں میں 10091 بچوں نے 95 فیصد سے زیادہ نمبرات حاصل کیے ہیں جبکہ پچھلی بار یہ اعداد وشمار 9351 تھا۔

رابعہ گرلز اسکول کا بارہویں کا رزلٹ 100 فیصد

ثمر افضل نے اردو میں 100 نمبر حاصل کر اسکول کا نام روشن کیا

نئی دہلی 29 مئی (پریس ریلیز) پرانی دہلی کی مشہور ومعروف رابعہ گرلز پبلک اسکول کا بارہویں کلاس کا رزلٹ گزشتہ سال کی طرح امسال بھی 100 فیصد رہا۔ اس سال رابعہ گرلز پبلک اسکول کی 87 طالبات نے امتحان میں شرکت کی تھی اور سبھی طالبات نے نمایاں نمبرات حاصل کر کے

اسکول کا نام روشن کیا۔ اسکول کی پرنسپل ڈاکٹر ناہید عثمانی کی بہترین سرپرستی کا ہی نتیجہ ہے کہ رقیہ مجیب نے سائنس میں 89.2 فیصد، زہرہ رضوان نے کامرس میں 88.8 فیصد اور صفیہ سید نے آرٹس میں 93.6 فیصد نمبر حاصل کرکے اسکول میں ٹاپ کیا۔ علاوہ ازیں آرٹس میں بادیہ سلیم کو 91.6 فیصد اور خدیو ایمن کو 92 فیصد نمبر حاصل ہوا۔ ہوم سائنس میں رفیعہ رحمٰن نے 99 نمبر حاصل کیا۔ اس سال اسکول کی اردو سبجیکٹ میں کارکردگی انتہائی قابل قدر ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انگریزی میڈیم اس اسکول کی 60 میں سے 49 بچیوں نے اردو میں ڈسٹنکشن نمبر حاصل کیا اور 21 بچیاں تو ایسی ہیں جنھوں نے 90 سے زائد نمبر حاصل کیے۔ ثمر افضل نے تو پورے 100 نمبر حاصل کر نہ صرف اپنے اسکول کا نام روشن کیا بلکہ یہ ثابت کر دیا کہ اردو ٹیچر ڈاکٹر سمیہ مسعود اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی انجام دے رہی ہیں۔

قابل ذکر ہے کہ رابعہ گرلز پبلک اسکول 'ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی' کے ماتحت ہے جس کے ایڈیشنل سکریٹری سید ثمر حامد ہیں۔ انھوں نے اس اسکول میں تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے ہرممکن کوشش کی ہے۔ اسکول کے منیجر پروفیسر اطہر نے بھی طالبات کے لیے ہر طرح کے انتظام وانصرام پر اپنی نظر رکھی اور ہر اس مسئلہ کا حل نکالنے کی کوشش کی جس سے کہ بچوں کی تعلیم پر منفی اثر پڑتا ہوا محسوس ہوا۔

ویمنس پالی ٹیکنک میں تقسیم انعامات کی تقریب کا انعقاد

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ویمنس پالی ٹیکنک کے زیر اہتمام منعقدہ سالانہ تقریب میں مہمان خصوصی محترمہ صبیحہ یحییٰ شاہ اور اعزازی مہمان رضوانہ علی اور پروفیسر ایس این زیبا، پروفیسر شمیم احمد و پروفیسر ذکیہ ارشد نے مختلف ادبی وثقافتی مقابلوں کی فاتح طالبات کو انعامات سے سرفراز کیا۔ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے محترمہ صبیحہ یحییٰ شاہ نے کہا کہ آج

کے مقابلہ کے دور میں طالبات سنجیدگی کے ساتھ پڑھائی پر توجہ مرکوز کریں۔ انھوں نے طالبات کو سخت محنت کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ رضوانہ علی نے طالبات سے کہا کہ وہ اپنا ہدف مقرر کرکے اس کے حصول کے لیے سخت محنت کریں۔

ویمنس پالی ٹیکنک کی پرنسپل ڈاکٹر سلمیٰ شاہین نے سالانہ رپورٹ پیش کی۔ سوسائٹی کی انچارج ڈاکٹر شیبا کمال نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ کریتی کلشر یشٹھ نے حاضرین کا خیر مقدم کیا جبکہ امین فاطمہ نے تلاوت کلام پاک کا فریضہ انجام دیا۔

علی گڑھ کی 'بزم ادب خواتین' کی خصوصی نشست میں بیگم راشدہ خلیل کا اظہار خیال

علی گڑھ کی ممتاز ادبی بزم 'بزم ادب خواتین' کی خصوصی نشست ذکیہ علوی کی رہائش گاہ واقع جامعہ اردو میڈیکل روڈ پر منعقد ہوئی جس کا آغاز تلاوت کلام پاک وترجمہ سے ہوا۔ نشست میں بزم کی صدر ڈاکٹر ساجدہ نبی اور بزم کی سکریٹری راشدہ خلیل نے ممتاز فکشن نگار ڈاکٹر افشاں ملک کے افسانوی مجموعہ "اضطراب" کا مشترکہ طور پر اجراء کیا۔ بزم کی سکریٹری راشدہ خلیل نے کہا کہ "اضطراب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا پیش لفظ ڈاکٹر افشاں ملک نے آپ بیتی کے طور پر تحریر کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بزم ادب خواتین کی کوشش رہی ہے کہ وہ نئی قلمکاروں کی حوصلہ افزائی کرے اور محترمہ ڈاکٹر افشاں ملک معیاری افسانے تخلیق کرنے ساتھ ہی نئی فکشن نگاروں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے کر ان کی حوصلہ افزائی بھی کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر افشاں ملک نے تمام اراکین بزم کو اپنے مجموعہ کی کاپیاں تقسیم کیں۔ نشست کے دوسرے دور میں بیگم کہکشاں خاں، بیگم عاقلہ یعقوب اور محترمہ شمیم آصف نے مختلف موضوعات پر اپنے مضامین پیش کیے۔ بیگم آصف اظہار نے اپنا ایک تازہ افسانہ "اس نے کہا تھا" پڑھ کر سنایا۔ یہ افسانہ آج کی نئی نسل کے اپنے والدین کے ساتھ افسوسناک رویہ پر مبنی تھا۔ محترمہ انجم قدوائی نے "آم" کے پھل پر سیر حاصل مضمون پیش کیا جبکہ بیگم ڈاکٹر فائزہ عباسی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ (ریٹائرڈ) کے دور میں ہونے والی اے ایم یو کی ترقیات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا وہ جنرل شاہ کے دور کو اے ایم یو کی تاریخ کے زرین دور کے طور پر یاد رکھا جائے گا اور ان کے دور میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے تعلیمی وتحقیقی میدان میں جو حاصلات درج کیے ہیں وہ ہماری تاریخ کا روشن باب بنیں گے۔ آخر میں بزم کی سکریٹری محترمہ راشدہ خلیل نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ نشست کا اختتام ذکیہ بھابھی کی شاندار تواضع پر ہوا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

کلیات مضامین وحید اختر (جلد چہارم)
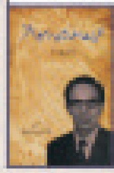
مرتب: ڈاکٹر سرور الہدیٰ
صفحات: 305
قیمت: 160 روپے

کلیات مضامین وحید اختر (جلد پنجم)
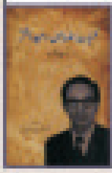
مرتب: ڈاکٹر سرور الہدیٰ
صفحات: 204
قیمت: 115 روپے

کلیات مضامین وحید اختر (جلد ششم)
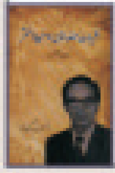
مرتب: ڈاکٹر سرور الہدیٰ
صفحات: 216
قیمت: -/115 روپے

آئینہ جہاں، کلیات قرۃ العین حیدر (جلد پنجم: رپورتاژ)
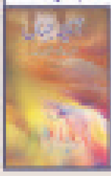
تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 407
قیمت: 182 روپے

آئینہ جہاں، کلیات قرۃ العین حیدر (جلد ہفتم: مضامین)
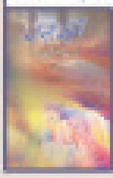
تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 359
قیمت: 165 روپے

عظیم سائنسداں (مع ترمیم و اضافہ)
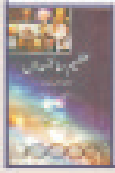
مصنف: اسرار حسین
صفحات: 121
قیمت: -/32 روپے

اسرار کشف صوفیہ 1068ھ مطابق 1858)
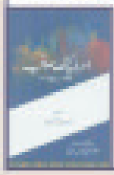
مصنف: سید محمد کمال سنبھلی واسطی
تدوین و تصحیح متن و ترجمہ
و حواشی: ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی
صفحات: 803، قیمت: -/335 روپے

انتخاب سخن (جلد اوّل) سلسلہ شاہ حاتم
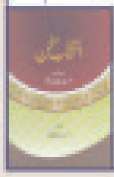
مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 388
قیمت: -/175 روپے

دستور ہند کا معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر
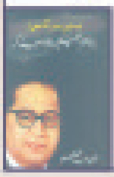
مصنف: خواجہ عبدالمنتقم
صفحات: 155
قیمت: 70 روپے

داستان گو آیا ہے
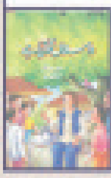
مصنف: رتن سنگھ، مصور: فجر الدین
صفحات: 16
قیمت: 25 روپے

ہماری نظم
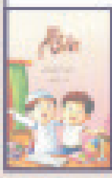
مصنف: فراغ روہوی
مصور: فجر الدین
صفحات: 20، قیمت: 30 روپے

دوسرا آدمی

مصنف: قاسم خورشید
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

زمین
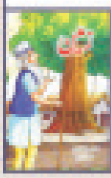
مصنف: قاسم خورشید
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

اذان
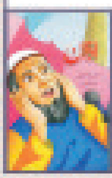
مصنف: قاسم خورشید
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

طوطا کہانی

مصنف: محسن خان
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

انصاف
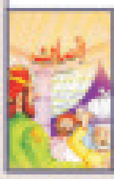
مصنف: محسن خان
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

ایک دکھ بھری کہانی
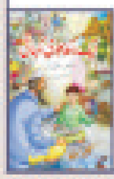
مصنف: اقبال برکی
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

کھانے کی کھیر
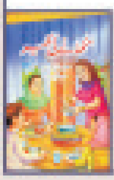
مصنف: ذکیہ مشہدی
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, July 2017, Vol. 01, Issue: 2
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI. REF. No. 1310440
Title Code-DELURD 03206

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

एक भारत श्रेष्ठ भारत

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

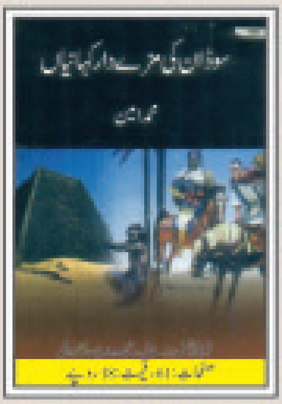

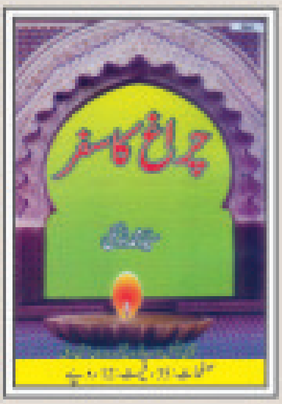

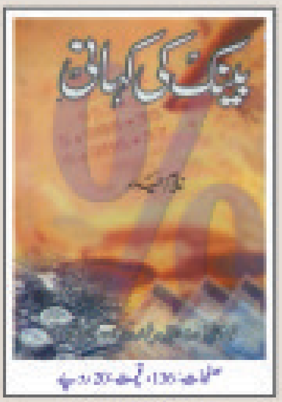

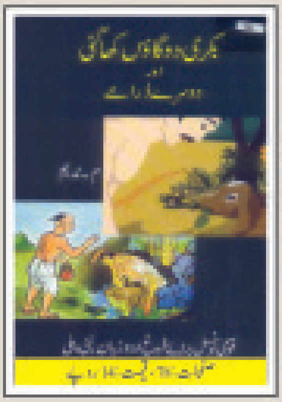

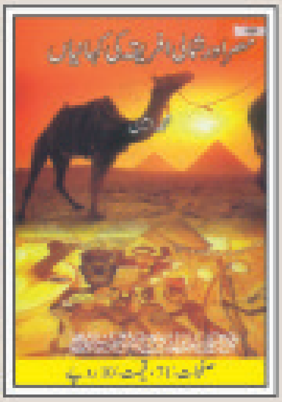

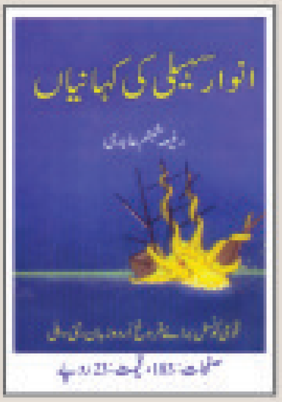

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025